upload by salimsalkhan@yahoo.com

ہیمر جنری

ملک صفدر حیات

کہتے ہیں محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے لیکن جائز اور ناجائز کی اپنی بھی ایک مسلّم حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ ناجائز ہر طور ایک منفی عمل ہے، چاہے اسے کسی بھی میدان میں کیوں نہ آزمایا جائے اور منفی طرزِ عمل کبھی خوشگوار نتائج نہیں لاتا۔ جلد یا بدیر اس کے سنگین اثرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ایک بھری پُری رات کو پیش آنے والا خونریز واقعہ ملک صاحب کی ڈائری سے

گلابی جاڑا جوبن پر تھا۔ فضا میں رومان پرور خوشگواریت رچی بسی تھی۔ دن بھر دھوپ میں گھومیں یا سائے میں ستانے بیٹھ جائیں موسم کا ہر انداز بھلا لگتا تھا۔ دو روایتی موسموں کے بیچ کا عرصہ بڑا سکستی خیز اور کیف آور ہوتا ہے۔ جذبات میں نئی امنگ اور اچھل پیدا کرتا ہے۔ دلوں کو گرماتا اور کچھ کر گزرنے پر اکساتا ہے۔ ایسے میں عموماً انسان بے اختیار ہو جاتا ہے۔

وہ بھی ایسے ہی گلابی موسم کی ایک چاندنی رات تھی۔

میں اس وقت اپنے کوارٹر کے مختصر سے صحن میں ٹہل رہا تھا۔ یہ ٹہلنا خلافِ معمول تھا۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ عام طور پر میں رات کا کھانا کھانے کے بعد عشا کی نماز ادا کرتا اور پھر سونے کے لیے بستر پر لیٹ جایا کرتا تھا۔ ایسی بات نہیں کہ اس رات مجھے نیند نہ آرہی ہو نیند پورے طمطراق کے ساتھ آنکھوں میں موجود تھی مگر میں دانستہ صحن میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ چاندنی رات کی ایسی پُرلطف فضا سے منہ موڑ کر بے رات لمبی تان کر سو جانا میرے نزدیک کفرانِ نعمت تھا۔ سو میں قدرت کی نوازش سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

صحن میں ایک سرے سے دوسرے سرے کی جانب ٹہلتے ہوئے اچانک میرے قدم رک گئے۔ کوارٹر کے بیرونی دروازے پر تیز دستک ابھری تو میں چونک کر اس طرف دیکھنے لگا۔ یقیناً تھانے میں کوئی ایمرجنسی پیش آگئی تھی ورنہ میری طرف رجوع نہ کیا جاتا۔ چھوٹے موٹے معاملات کو شبینہ ڈیوٹی والے اہلکار خود ہی نمٹا لیا کرتے تھے۔

یہی سب سوچتے ہوئے میں دروازے کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس دوران میں دستک کے عمل کو دہرایا جا چکا تھا۔ میں نے کنڈی گرا کر کوارٹر کا دروازہ کھول دیا۔ سامنے حوالدار خیبر خان کھڑا تھا۔

''ملک صاحب! بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ آپ کو ابھی تھانے آنا ہوگا۔'' وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے الجھن زدہ انداز میں حوالدار کو دیکھا اور پوچھا ''خیبر خان! کس قسم کی گڑبڑ ہوگئی؟''

''جناب! اغوا، قتل اور ڈکیتی کا معاملہ ہے۔'' حوالدار نے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''تم چلو میں دس منٹ میں آرہا ہوں۔''

حوالدار خیبر خان کو دروازے پر سے رخصت کر کے میں اپنے کوارٹر کے اکلوتے کمرے میں پہنچا۔ میں نے ممکنہ تیزی سے یونیفارم زیبِ تن کی اور تھانے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ میرا کوارٹر تھانے کی چوحدی کے اندر ہی عقبی جانب واقع تھا۔ ٹھیک سات منٹ بعد میں اپنے مخصوص کمرے میں موجود تھا۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے میں نے درجن بھر افراد کو وہاں بیٹھے...... اور کھڑے دیکھ لیا تھا۔ حوالدار خیبر خان بھی ان سے ''مذاکرات'' میں مصروف تھا۔ وہ میرے پیچھے ہی کمرے میں چلا آیا اور نہایت ہی مختصر الفاظ میں اس نے مجھے تہرے جرم کی اس واردات کے بارے میں بتایا۔

اس کے مطابق ایک برات چک بتیس سے واپس چک چوراسی کی طرف آرہی تھی کہ راستے میں ڈاکوؤں کے ایک مسلح گروہ نے برات پر حملہ کر دیا اور آناً فاناً میں اپنا کام کر کے اسی طرح گھنے جنگل کی تاریکی میں غائب ہو گئے جیسے اچانک نمودار ہوئے تھے۔ اس مختصر سی مجرمانہ کارروائی میں دلہا جس کا نام عارف تھا، قتل ہو گیا۔ دلہن اور زیورات کے صندوق کو ڈاکو اپنے ساتھ لے گئے۔ مزاحمت کی کوشش میں کئی براتی شدید زخمی ہو گئے جنہیں اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔

چک چوراسی تھانے سے جنوب مشرق میں نصف میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ چک بتیس مغرب میں لگ بھگ سات میل دور واقع تھا۔ یہ دونوں گاؤں میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے۔ دونوں چک کے درمیان چار پانچ میل کا علاقہ گھنے جنگل پر مشتمل تھا۔ دونوں گاؤں کو ملانے والا راستہ جنگل کے اندر سے ذرا ہٹ کر گزرتا تھا اور یہ تہرے جرم کی واردات راستے کے وسط میں عمل میں آئی تھی۔ جس میں مسلح حملہ آور ڈاکو دلہا کو قتل کر کے دلہن کو اٹھا لے گئے تھے اور جاتے جاتے

طلائی زیورات والا صندوق بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

واقعات کے مطابق "آج" چک چوراسی سے عارف کی برات چک بتیس کے لیے روانہ ہوئی۔ دوپہر سے پہلے وہ لڑکی والوں کے گاؤں پہنچ گئے۔ نکاح اور دیگر رسموں سے فارغ ہوتے ہوتے شام ہوگئی۔ لڑکی والوں نے اصرار کیا کہ رات کا کھانا کھا کر جائیں لہٰذا چک بتیس سے برات کی واپسی میں کافی دیر ہوگئی۔ رات کی تاریکی میں جب یہ لوگ جنگل میں سے گزرے تو ڈاکوؤں کو "سرگرمی" دکھانے کا موقع مل گیا۔ اور اب یہ متاثرہ افراد فریاد لے کر میرے پاس آئے تھے۔

برآمدے سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے میں نے دیکھا تھا فریادیوں میں مرد و زن دونوں شامل تھے۔

میں نے حوالدار کی بات توجہ سے سنی اور پوچھا۔

"خیبر خان! تم نے تو ان لوگوں کا اچھا خاصا انٹرویو کرلیا ہے۔ ان میں سے دو تین معقول افراد کو میرے پاس لاؤ تاکہ میں پوچھ گچھ کرسکوں۔"

حوالدار "یس سر" کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد چار افراد میرے سامنے حاضر ہوگئے۔ ان میں ایک مقتول دولہا کا باپ خدابخش تھا۔ خدابخش کی عمر لگ بھگ پچپن سال رہی ہوگی۔ وہ بھاری جثے اور مضبوط ڈیل ڈول کا مالک تھا لیکن اس اندوہناک واقعے نے اس کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ وہ بہت ہی گھبرایا ہوا اور خستہ حال دکھائی دیتا تھا۔

دوسرا شخص نذیر علی تھا۔ نذیر دلہن کا پھوپھا تھا۔ وہ اپنی بیوی زاہدہ اور پانچ سالہ بچے سلیمان کے ساتھ چک بتیس سے برات کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ایک شخص سکندر تھا۔ سکندر دلہن کی پھوپھی زاد بہن کا شوہر تھا۔ سکندر اور اس کی بیوی فرحت بھی دلہن والوں کی طرف سے برات کے ساتھ آئے تھے۔

چوتھا فرد ایک پندرہ سالہ لڑکا تھا۔ اس کا نام طارق معلوم ہوا۔ طارق دولہا کا چھوٹا بھائی تھا۔ ان چار افراد نے ملتا جلتا بیان دیا جس کے مطابق وہ لوگ دلہن کو لے کر چک بتیس سے چک چوراسی کی طرف آرہے تھے کہ راستے میں مسلح ڈاکوؤں کے ایک جتھے نے ان پر حملہ کردیا۔ تفصیل کچھ یوں تھی۔

اس برات میں لگ بھگ پینتالیس افراد شامل تھے۔ سب سے آگے ایک گھڑسوار شخص حبیب اللہ تھا۔ حبیب اللہ کے پاس ریوالور موجود تھا۔ حبیب اللہ کے پیچھے دو گھڑسوار تھے۔ ایک دلہا کا برادر خورد طارق اور دوسرا لیاقت۔ یہ دونوں غیر مسلح تھے۔ ان دونوں کے عقب میں تین گھڑسوار تھے۔ درمیان میں دلہا عارف اور دائیں بائیں اس کے دو دوست صفدر اور ہارون۔ ان چھ گھڑسواروں کے پیچھے پانچ بیل گاڑیاں تھیں۔ پہلی بیل گاڑی پر دلہن والی ڈولی رکھی گئی۔ چک چوراسی کے قریب پہنچنے کے بعد ڈولی کو باقاعدہ اٹھالیا جاتا۔ ڈولی والی بیل گاڑی پر دلہا اور دلہن کے گھر کی عورتیں بھی سوار تھیں۔ تحائف اور زیورات والا صندوق بھی اسی بیل گاڑی پر تھا۔

دوسری بیل گاڑی پر ملی جلی عورتیں، تیسری پر مرد حضرات سوار تھے۔ چوتھی اور پانچویں بیل گاڑی پر جہیز کا ساز و سامان لدا ہوا تھا۔ بیل گاڑیوں کے پیچھے آخر میں تین گھڑسوار تھے جن میں سے دو، عمردین اور رفیق کے پاس بندوقیں تھیں مگر بندوقوں کے استعمال سے پہلے ہی ڈاکوؤں نے انہیں بے بس کرکے شدید زخمی کردیا۔ ریوالور بردار حبیب اللہ بھی شدید زخمی ہو کر عمر دین اور رفیق کے ساتھ ہی اسپتال پہنچ گیا تھا۔ دیگر مردوں کے پاس کلہاڑیاں اور لاٹھیاں موجود تھیں لیکن ڈاکوؤں نے انہیں کسی قسم کی مزاحمت کا موقع ہی نہ دیا۔ انہوں نے مسلح براتیوں کو شدید زخمی کیا' دلہا کو قتل کیا اور زیورات والے ٹرنک کے ساتھ ہی دلہن کو اٹھالے گئے۔ زخمی افراد کو اسپتال بھجوانے کے بعد یہ لوگ دلہا کی لاش کو لے کر میرے پاس تھانے آگئے تھے۔

میں نے گھما پھرا کر باری باری ان چاروں سے مختلف سوالات کیے لیکن واردات کی وقوع پذیری کے احوال میں کوئی خاص فرق نمودار نہ ہوا اور یہی صورت حال میرے لیے تشویش کا باعث تھی۔ اس براتی قافلے میں کم و بیش چار درجن افراد شامل تھے جن میں غالب تعداد مردوں کی تھی۔ بعض ان میں مسلح بھی تھے اور اکثر کے پاس لاٹھیاں اور کلہاڑیاں وغیرہ بھی تھیں۔ یہ لوگ نصف درجن ڈاکوؤں کا بال بھی بیکا نہ کرسکے اور وہ لوگ بڑے مزے سے اپنا کام کرکے چلتے بنے۔ یہ ہضم ہونے والی بات نہیں تھی۔ مجھے تو یہ ایک گہری سازش کا شاخسانہ دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے تفصیلی پوچھ گچھ سے پہلے لاش کا معائنہ ضروری سمجھا۔ مبینہ طور پر قتل' ڈکیتی اور اغوا کی وہ واردات رات نو بجے کے قریب عمل میں آئی تھی۔ دلہا عارف ایک سو ایک فیصد زندوں میں نہیں رہا تھا۔ اس کے جسم میں چار پانچ گولیاں اتاری گئی تھیں۔ لالٹین کی روشنی میں لاش کا حتمی معائنہ تو نہیں ہوسکتا تھا تاہم مجھے یہ اندازہ لگانے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ دل میں پیوست ہونے والی گولی نے اس کی زندگی کا چراغ گل کردیا تھا۔

میں نے مزید آدھے گھنٹے میں ضابطے کی کارروائی مکمل

کی اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال بھجوادیا۔ جائے وقوعہ کا جائزہ لینا بہت ضروری تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ مقام تھانے سے مغرب میں کم و بیش ایک میل دور جنگل میں واقع تھا۔ میں نے چشم دید گواہوں کے سرسری بیان سے یہ اندازہ تو لگالیا کہ واردات کے بعد گھڑسوار ڈاکوؤں نے کس سمت کا رخ کیا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ لوگ واردات کے مقام سے جنوب کی طرف گئے تھے۔ اس جانب دو ڈھائی میل کے رقبے پر پھیلا ہوا گھنا جنگل تھا اور تین چار میل کے بعد سلطان پورہ نامی ایک قصبہ واقع تھا۔ اگر وہ لوگ باقاعدہ ڈاکو تھے تو ان کا تعلق اسی جنگل سے ہوسکتا تھا اور اگر وہ محض ڈاکوؤں کے بھیس میں تھے تو پھر وہ سلطان پورہ کے رہنے والے بھی ہوسکتے تھے۔

جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہونے سے پہلے میں نے چار اہلکاروں پر مشتمل ایک پولیس پارٹی ترتیب دی۔ ان کے ساتھ مزید دو براتی بھی شامل کردیے۔ پھر ان چھ افراد کو میں نے جنگل کے راستے سلطان پورہ کی جانب پیش قدمی کی ہدایت کرکے تھانے سے روانہ کردیا۔

واردات کو اگرچہ ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا مگر ڈاکوؤں کا تعاقب اور سراغ رسانی بہت ضروری تھی۔ ان لوگوں کے قبضے میں دلہن تھی جو بدقسمتی سے کنواری بیوہ کا ٹائٹل حاصل کرچکی تھی۔ زیورات والے صندوق کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں مگر دلہن کو ڈاکوؤں کے چنگل سے نکالنا فوری طور پر ضروری تھا۔ وہ سفاک لوگ پہلے ہی دلہا کو قتل کرکے اپنے وحشی ہونے کا ثبوت فراہم کرچکے تھے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں فریادیوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔ مقتول دلہا کے باپ خدابخش کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ منت ریز لہجے میں بولا۔

"تھانے دار صاحب! پوچھ پرتیت تو بعد میں بھی ہوتی رہے گی۔ اس وقت آپ ہمیں گھر جانے دیں۔ شادی والا گھر ماتم کدے میں بدل چکا ہے۔ اس کی خبر لینا زیادہ ضروری ہے۔"

اس کی بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے' تم گھر کی عورتوں کو لے کر گھر پہنچو۔ میں جائے واردات سے واپسی پر تمہارے پاس آؤں گا۔ باقی کارروائی تمہارے گھر میں بیٹھ کر ہی ہوگی۔" ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔

"میں دو تین بندوں کو ادھر ہی روک رہا ہوں۔ یہ میرے ساتھ جائے وقوعہ پر جائیں گے۔ یہ چشم دید گواہ ہیں۔ وہاں ان کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔"

خدابخش نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ تھانے سے روانہ کرنے سے پہلے میں نے ان درجن بھر مرد و زن کے ناموں کی ایک فہرست تیار کرلی تاکہ بعد میں بیانات لیتے وقت آسانی رہے۔ ان افراد میں دلہا اور دلہن خاندان کے مرد اور عورتیں شامل تھیں۔ دلہن کا نام رافعہ عرف رانی معلوم ہوا۔ مقتول دلہا عارف' رانی کے چچا کا بیٹا تھا۔

جائے وقوعہ ایک اندازے کے مطابق تھانے سے لگ بھگ میل سوا میل دور تھی۔ جو صورت حال سامنے آئی اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا' وہاں اچھی خاصی فائرنگ ہوئی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر میں نے ایسی کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ان دنوں مخالف رخ کی ہوائیں بڑے زور و شور سے چل رہی تھیں جن کے باعث موسم کی خنکی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا۔

میں نے اے ایس آئی ظاہر علی کو اپنے کمرے میں بلایا اور کہا۔ "میں حوالدار خیبر خان کے ساتھ موقع واردات کا جائزہ لینے جارہا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں تم تھانے کو اپنے کنٹرول میں رکھنا۔"

"آپ بے فکر ہوجائیں ملک صاحب!" وہ اعتماد سے بھرپور لہجے میں بولا "آپ کو کسی قسم کی شکایت نہیں ہوگی۔"

ظاہر علی بہت ہی ذمے دار اور فرض شناس اے ایس آئی تھا اور ظاہر ہے' ان دنوں وہ شبینہ ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ میں نے خیبر خان کے علاوہ ایک ہوشیار قسم کے کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور جائے واردات کی طرف روانہ ہوگیا۔

ہم تینوں پوری طرح مسلح تھے اور ہر نوعیت کی خوشگوار یا ناخوشگوار صورت حال سے نمٹنے کے لیے ایک دم تیار۔ چاندنی رات میں گھوڑوں پر سوار ہوکر جنگل کی طرف رخ کرنا کسی سنسنی خیز تجربے سے کم نہیں ہوتا۔ میرا ذہن اس وقت مسلسل اس واردات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دو براتیوں کو بھی میں نے رہنمائی کے لیے ساتھ لے لیا۔ وہ دونوں ایک ہی گھوڑے پر سوار تھے۔ ان کے نام وزیر علی اور امداد حسین تھے۔ ان کا تعلق دلہن کے گاؤں چک بتیس سے تھا۔

خدابخش' سکندر' نذیر علی اور طارق نے مجھے بتایا تھا' ڈاکوؤں کا وہ جتھا اچانک ہی تاریکی سے نکل کر ان پر حملہ آور ہوگیا تھا اور پلک جھپکنے میں اپنا کام کرکے وہ تاریکی میں غائب ہوگئے۔ پتا نہیں تاریکی سے ان کی مراد گھنا جنگل تھا یا وہاں کی خاموشی اور سناٹا ورنہ وہ ایک چاندنی رات تھی۔ زیادہ دور تک نہ سہی مگر ایک حد تک تو ضرور دیکھا جاسکتا تھا۔ یہ بھی

upload by salimsalkhan

ممکن تھا وہ لوگ پریشانی کے عالم میں رات کی مناسبت سے بار بار تاریکی کا ذکر کر بیٹھے ہوں۔ بہرحال اس حوالے سے ابھی کئی سوال اپنے جواب حاصل کرنے کے منتظر تھے!

اب تک جو حالات میرے علم میں آئے تھے ان سے میں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں تو کامیاب ہو گیا کہ ڈاکوؤں کو براتی قافلے کے ٹائم ٹیبل' واپسی میں ہونے والی تاخیر اور دیگر ہر نوعیت کی معلومات رکھتے تھے۔ انہیں یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ برات میں شامل افراد میں سے صرف تین کے پاس آتشیں اسلحہ موجود ہے۔ حبیب اللہ' عمردین اور رفیق۔ انہوں نے ان تین افراد کو آناً فاناً میں شدید زخمی کر کے کسی قسم کے مقابلے یا مزاحمت کے قابل نہیں چھوڑا۔ لاٹھی اور کلہاڑی بردار افراد کو وہ خاطر ہی میں نہیں لائے اور دلہن کے ساتھ ہی زیورات والے صندوق کو سمیٹ کر چلتے بنے۔

یہاں پر حیرت کا ایک اور پہلو بھی اجاگر ہوتا تھا اور وہ یہ کہ براتیوں میں سے کسی نے ڈاکوؤں کا پیچھا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یہ پہلو بھی ذہن کو بری طرح الجھا رہا تھا۔

اس جنگل کے حوالے سے ڈاکوؤں کی چھوٹی موٹی وارداتوں سے متعلق کہانیاں سننے میں آتی رہتی تھیں لیکن اس برات کے ساتھ جس نوعیت کا واقعہ پیش آیا تھا وہ کسی سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ ڈاکوؤں کی معمول کی واردات نہیں تھی بلکہ ایک بھرپور انتقامی کارروائی دکھائی دیتی تھی۔

اس انداز میں سوچتے ہوئے لامحالہ ذہن میں یہ سوال ابھرا..... ڈاکوؤں کا وہ گروہ کس سے انتقام لینا چاہتا تھا؟ دولہا سے' دلہن سے یا پھر دونوں سے؟ تینوں صورتوں میں سے کچھ بھی ممکن ہو سکتا تھا۔ یہ ایک سیدھی سادی دشمنی پر مبنی انتقامی کارروائی نظر آتی تھی۔

حوالدار کی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ملک صاحب! آپ کے ساتھ کام کرنا بہت مشکل ہے۔"

"تو پھر تم اپنا تبادلہ کسی اور تھانے میں کروا لو۔" میں نے روا روی میں کہہ دیا "جب تک میں اس تھانے کا انچارج ہوں' یہ مشکل تو بہرحال رہے گی!"

"جناب! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔

"پھر کیا مطلب تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو آپ کی تعریف کر رہا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا "آپ کی جگہ کوئی اور تھانے دار ہوتا تو آدھی رات کو یوں اٹھ کر جائے واردات کی طرف نہ چل پڑتا..... اور وہ بھی ایک سنسان' بیابان جنگل میں۔"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "خیبر خان! میں اس وقت جو کچھ بھی کر رہا ہوں وہ میرے فرائض کا حصہ ہے اور میرا خیال ہے' ہر تھانے دار کو اس موقع پر یہی طرز عمل اپنانا چاہیے۔"

"بے شک جناب!" حوالدار نے تائیدی انداز میں کہا۔ "آپ کے ساتھ کام کرتے ہوئے ہر لمحہ عزم جوان رہتا ہے۔ جسم میں ایک کرنٹ سا دوڑتا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "ہر چیز کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ کسی بھی وجود کی زندگی اور صحت کے لیے اس کرنٹ کی اشد ضرورت ہے جو عزم کے بغیر ممکن نہیں۔ جو افسر خود کاہل الوجود ہوتے ہیں ان کے پیچھے کا عملہ بھی سستی کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے بالآخر ایک روز یہ آرام طلب مشینری زنگ آلود ہو کر ناکارہ ہو جاتی ہے۔ چوروں' ڈاکوؤں اور خطرناک مجرموں پر ہاتھ ڈالنا تو دور کی بات ہے یہ لوگ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا تک نکالنے کے قابل نہیں رہتے۔"

وہ خاموشی سے میری باتیں سنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم براتیوں کی رہنمائی میں جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ اس جگہ پر اچھی خاصی افراتفری کے آثار نظر آ رہے تھے' دن کی روشنی میں اور بھی واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ میں گھوم پھر کر اس جگہ کا جائزہ لینے لگا۔

ایک بات تو طے تھی اور وہ یہ کہ کل صبح یہاں آ کر ایک مکمل سروے کرنے کی ضرورت تھی۔ آدھے گھنٹے تک میں وہاں موجود رہ کر مختلف اندازے قائم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ خدا بخش وغیرہ نے مجھے بتایا تھا' واردات کے بعد ڈاکو جنوبی سمت جنگل میں غائب ہوئے تھے۔ اس طرف دو ڈھائی میل تک گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا' پھر کوئی تین چار میل کے بعد موضع سلطان پورہ واقع تھا۔ سلطان پورہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔

میں نے تصدیق کی خاطر جنوب کی طرف اشارہ کیا اور وزیر علی و امداد حسین کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا "کیا ڈاکو دلہن اور صندوق کو لے کر اسی سمت گئے تھے؟"

انہوں نے جواب دینے سے پہلے معنی خیز نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا اور باری باری سر ہلاتے ہوئے بولے "جی ہاں' جی ہاں۔"

"کیا تمہیں ڈاکوؤں کے بارے میں کچھ اندازہ ہے؟" میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟"

"ڈاکو تو جناب' بس ڈاکو ہی ہوتے ہیں۔" وزیر علی نے

لہجے میں جواب دیا۔ "ان کے بارے میں کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔"

امداد حسین نے کہا "یہ تو بہت برا ہوا جناب۔ وہ بدبخت لوٹ کر لے گئے۔ پتا نہیں ایسے لوگوں کو قدرت نے کیوں ڈھیل دے رکھی ہے۔"

"یہ ڈھیل عارضی ہوتی ہے امداد حسین۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "سمجھو ان ڈاکوؤں کی پکڑ کا وقت آ گیا ہے۔ انہوں نے میرے تھانے کی حدود میں تیرا جرم کر کے اپنے حق میں اچھا نہیں کیا۔ میں انہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔"

اسی وقت کانسٹیبل تقریباً دوڑتے ہوئے ہماری جانب آیا۔ مجھے براتیوں کے ساتھ باتوں میں مصروف دیکھ کر وہ ادھر ہی آ گیا۔ کانسٹیبل منظور بے حد تجسس طبیعت کا مالک تھا۔ اسے ہر وقت کسی نہ کسی شے کی کھوج لگی رہتی تھی اور یہ اس کے پیشے کی بڑی کارآمد بات تھی۔ وہ جس ڈیپارٹمنٹ میں کام کر رہا تھا اس میں تجسس کا مادہ بہت مفید ثابت ہوتا ہے!

منظور نزدیک آیا تو میں اسے دیکھ کر چونک اٹھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک سفید کپڑا پکڑ رکھا تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے اضطراری انداز میں استفسار کیا۔

"یہ کیا ہے' منظور علی؟"

"ململ کا دوپٹا ہے جناب!" اس نے مذکورہ کپڑا میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے کپڑے کو ہاتھوں میں لے کر چیک کیا۔ وہ واقعی ململ کا ایک دوپٹا تھا۔ یہ موسم ململ کے دوپٹے کا ہرگز نہیں تھا لہٰذا مجھے شدید حیرت ہوئی۔ میں نے کانسٹیبل سے پوچھ لیا۔

"یہ تمہیں کہاں سے ملا؟"

"ادھر ایک درخت کے تنے سے بندھا ہوا تھا۔" اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے اس کے اشارے کی سمت نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ جنگل کا شمالی حصہ تھا۔ اس طرف کسی درخت کے تنے سے ململ کے دوپٹے کا بندھا ہوا ملنا فکر انگیز اور تعجب خیز بات تھی۔ میری معلومات کے مطابق ڈاکو دلہن اور زیورات والے صندوق کو لے کر جنگل کے جس حصے میں داخل ہوئے تھے وہ اس راستے کی جنوب کی سمت واقع تھا جبکہ مذکورہ سفید ململ کا دوپٹا شمالی والے حصے میں ایک درخت کے تنے سے بندھا ہوا ملا تھا۔

وہ جنگل کوئی تفریحی مقام نہیں تھا جو یہ سوچ لیا جاتا کہ کوئی پکنک پارٹی وہ دوپٹا وہاں چھوڑ گئی ہوگی۔ اس دوپٹے کا تعلق ڈاکوؤں ہی سے ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے کسی نشانی کے طور پر اسے درخت سے باندھ رکھا ہو!

میں تھوڑی دیر تک اس دوپٹے کے بارے میں سوچتا رہا پھر دیگر امور کی جانب متوجہ ہو گیا۔ جائے وقوعہ کا تفصیلی نقشہ تیار کرنے کے لیے صبح اس طرف آنا نہایت ضروری تھا اور یہ ممکن تھا دن کی روشنی میں ڈاکوؤں کا کوئی سراغ ہاتھ لگ جاتا۔ مزید چند منٹ وہاں رکنے کے بعد ہم نے واپسی کی راہ پکڑی کیونکہ لالٹینوں کی روشنی میں تلاش اور تفتیش جاری رکھنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا!

ہم واپسی کے لیے پلٹے ہی تھے کہ وزیر علی نے کہا "تھانے دار صاحب! آپ سے ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔"

"ہاں کہو' کیا بات ہے؟" میں رک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ بولا "اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم چک بتیس کی طرف جانا چاہتے ہیں۔"

ان دونوں کا تعلق دلہن کے گاؤں یعنی چک بتیس سے تھا۔ میں نے چونک کر کہا "اس میں مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے اور...... یہ تمہیں بیچ جنگل میں اچانک ادھر جانے کا خیال کیوں آیا؟"

وزیر علی کی بات سن کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا "جناب! اب ہم چک چوراسی جا کر کیا کریں گے۔ دولہا قتل ہو گیا' دلہن کو ڈاکو اٹھا لے گئے۔ کم از کم ہم دلہن والوں کو اس افسوسناک واقعے کی اطلاع تو دیں گے۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"آپ سے اجازت اس لیے لے رہے ہیں کہ ہم اکیلے ادھر نہیں جانا چاہتے۔ آپ لوگ کم از کم اس جنگل والے حصے میں ہمارے ساتھ چلیں۔ جب جنگل کی حد ختم ہو جائے تو آپ لوگ واپس آ جانا۔ آگے ہم خود ہی چلے جائیں گے۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے تصدیقی نظر سے اپنے ساتھی امداد حسین کی طرف دیکھا۔ امداد حسین نے اس کی نظر کے جواب میں اثبات میں گردن ہلا کر تائید کر دی۔ پتا نہیں کیوں مجھے ان دونوں کا انداز کچھ مشکوک سا لگا۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ جلد از جلد مجھ سے جان چھڑانے کی کوشش میں ہوں۔ ان کی اس کوشش نے مجھے ان کی طرف سے ہوشیار کر دیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے اور دو ٹوک لہجے میں کہا "اول تو یہ کہ میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں کہ میں تمہیں چھوڑنے کے لیے کہیں جاؤں۔ دوم' چک بتیس والوں کو اطلاع دینے یا پہنچانے کی فکر نہ کرو۔ یہ کام میں خود زیادہ اچھے انداز میں

کرواسکتا ہوں اور سوم..."

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا اور اضافہ کرتے ہوئے ایک لمحے کے بعد کہا "ابھی میں نے تم لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کرنا ہے۔ تم ایسے ہی سوکھے سوکھے تو نہیں جاسکتے نا!"

وہ عجیب سی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

میں نے حوالدار خیبر خان کو اشارہ کیا اور ہم واپسی کی راہ پر پلٹ پڑے تاہم میں نے یہ احتیاط ضرور برتی کہ چک بتیس والے وہ دونوں افراد میری نظر میں رہیں۔ تھوڑا آگے آنے کے بعد میں نے وزیر علی سے پوچھا۔

"تم کس ملک کے وزیر ہو بھئی؟"

"جناب! آپ بھی کیسا مذاق کررہے ہیں۔" وہ شرمندہ ہوتے ہوئے بولا "میں تو محض نام کا وزیر ہوں۔ کام دھندا تو مزدوری ہے۔ میری قسمت ایسی کہاں کہ کسی ملک کا وزیر بن سکوں۔"

"تم کس قسم کی مزدوری کرتے ہو؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"میں کھیت مزدور ہوں جناب۔" اس نے بتایا۔

"اور تمہارا یہ ساتھی کیا کرتا ہے؟"

"یہ بھی میرے ساتھ ہی ہوتا ہے۔"

میں نے پوچھا "تھوڑی دیر پہلے میں نے تم دونوں سے ایک سوال کیا تھا جس کا ابھی تک مجھے جواب نہیں ملا؟" پھر میں نے وزیر علی کو براہ راست دیکھتے ہوئے کہا "تم نے محض یہ کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کی تھی کہ...... ڈاکو تو جناب' بس ڈاکو ہی ہوتے ہیں۔" میں ایک لمحے کو رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس مرتبہ میرے استفسار میں اچھی خاصی درشتی شامل تھی۔

"صرف اس گول مول جواب سے کام نہیں چلے گا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں' تم ڈاکوؤں کے بارے میں کیا سوچتے ہو۔ وہ کون لوگ ہوسکتے ہیں؟"

امداد حسین نے کہا "جناب! یہ تو بہت مشکل سوال ہے۔ ہم ڈاکوؤں کے بارے میں کیسے کچھ بتاسکتے ہیں۔ وہ تو کالی آندھی کی طرح جنگل سے برآمد ہوئے تھے اور اپنا کام کرکے واپس چلے گئے۔ ہمیں ان سے سوال جواب کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی اور نہ ہی انہوں نے اپنی زبان سے ایک لفظ ادا کیا۔"

"ایک بات تو تم لوگوں کو ماننا ہوگی۔" میں نے ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "یہ ڈاکوؤں کی کوئی عام سی کارروائی نہیں ہے بلکہ صاف ظاہر ہورہا ہے' انہوں نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت گھات لگا کر برات پر ہاتھ ڈالا ہے۔ یہ کسی گہری دشمنی اور انتقام کا نتیجہ ہے۔ بتاؤ' دلہا اور دلہن کے خلاف ایسی سازش کون کرسکتا ہے؟"

وزیر علی نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا "... ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اب رانی بے چاری کی ڈاکوؤں سے ... ہوسکتی ہے۔ وہ تو خواہ مخواہ بدنصیب دلہا کی مصیبت ... ہوگئی۔ کیا قسمت پائی ہے اس نے بھی۔" اس کا انداز ... سے معمور تھا "رانی کو تو ایک رات کی دلہن بھی نہیں ... اس سے پہلے ہی اس کا سہاگ اجڑ گیا۔" بات ختم کر... اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی۔

میں نے کرید جاری رکھی اور کہا "ضروری نہیں ... واقعہ ڈاکوؤں کی دلہن سے کسی دشمنی کا نتیجہ ہو۔ ہوسکتا ہے ... نے کسی اور زاویے کی دشمنی یہاں نکالی ہو!" میں نے ... توقف کرکے سنسنی خیز لہجے میں اضافہ کیا "بعض ... والدین کے اعمال کا پھل بھی اولاد کے حصے میں آجاتا ہے۔"

تھوڑی دیر تک ان کی طرف خاموشی رہی۔ ... دونوں میری بات کو سمجھ نہیں سکے تھے پھر جب وزیر علی بولا تو اندازہ ہوا میرا سوال بڑے مناسب طریقے سے ان کے ... پڑ گیا تھا۔

"جناب! اللہ بخش صاحب تو بہت امن پسند ... ہیں۔ ہم نے آج تک انہیں کسی شخص سے معمولی سا ... کرتے نہیں دیکھا' دشمنی تو بہت دور کی بات ہے۔ اور ... بھی ڈاکوؤں کے گروہ سے' یہ بالکل ناممکن لگتا ہے۔"

اللہ بخش' خدا بخش کا بڑا بھائی تھا۔ دلہن رافعہ عرف ... اس کی بیٹی تھی۔ امداد حسین نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"جناب! ساری گڑبڑ عارف کی طرف سے نظر ... ہے۔ لگتا ہے اس کے کسی مخالف نے پرانی دشمنی نکالی ہے ... بھی بھیانک انتقام کا ایک طریقہ ہے کہ اپنے دشمن کو قتل ... اس کی بیوی کو اٹھالے جاؤ۔"

"اور مال غنیمت میں زیورات سے بھرا ہوا صندوق ... ساتھ لے جاؤ۔" حوالدار خیبر خان نے برجستہ کہا۔

وزیر علی اور امداد حسین کا تعلق چونکہ دلہن کے گاؤں ... بتیس سے تھا اس لیے ان کی حمایت اور ہمدردی سراسر اللہ ... وغیرہ کے ساتھ نظر آتی تھی۔ وہ سارے کا سارا الزام ... طرف ڈال رہے تھے۔ یہ واردات انہیں مقتول عارف کے دیرینہ دشمن کا کارنامہ نظر آرہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم گھوڑوں پر سوار چک چوراسی ... گئے۔

☆☆☆

... بخش کا گھر اس وقت ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ ... ایسا نہیں تھا کہ لوگ لمبی تان کر سوجاتے۔ رات ... زیادہ گزر چکی تھی مگر ابھی تک تمام افراد جاگ رہے ... خدا بخش کے گھر کی بیٹھک میں جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر ... میرے پاس موجود تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اس ... پر اظہار افسوس کیا اور کہا۔

"خدا بخش! میں اپنے فرائض سے مجبور ہوں ورنہ اس ... تکلیف نہ دیتا۔"

"... جو کچھ بھی کررہے ہیں' میری ہی بھلائی کے لیے ..." اس نے انتہائی معقول بات کی۔

... باقی افراد کو دوسرے کمرے میں بھیج کر خدا بخش کے ... مصروف ہوگیا۔ سب سے پہلے میں نے اسے ململ کا سفید ... اور اس کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے دوپٹے ... کا اظہار کرتے ہوئے اسے پہچاننے سے صاف انکار ...

"کم از کم یہ میرے گھر کی کسی عورت کا تو نہیں ہوسکتا۔" ... لہجے میں بولا "اس ٹھنڈے ٹھار موسم میں ایسے باریک ... کے استعمال کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج کل تو گرم ... استعمال ہورہی ہیں۔"

... کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ میں اسی نتیجے پر ... ڈاکوؤں نے وہ دوپٹا کسی نشانی کے طور پر اس درخت ... دیا تھا۔ سفید دوپٹے کو رات میں نسبتاً زیادہ آسانی ... جاسکتا تھا۔ ممکن ہے انہوں نے واردات کے لیے جو ... کی تھی' یہ دوپٹا اسی کا ایک حصہ ہو!

میں نے خدا بخش سے ایک اہم سوال کیا "ڈاکو اپنے ... تمہاری بہو رانی کے علاوہ ایک ٹرنک بھی اٹھالے گئے ... مجھے بتاؤ اس ٹرنک میں کیا کچھ بھرا ہوا تھا؟"

"سب سے زیادہ اہم تو زیورات ہی تھے۔" وہ ایک ... سانس خارج کرتے ہوئے بولا "وہ پورے پچیس تولے ... اور پچاس تولے چاندی کے زیورات تھے۔ اس کے علاوہ ... تحائف اور کامدار سوٹ بھی اس صندوق میں بھرے ... تھے۔"

خدا بخش ایک آسودہ حال زمیندار تھا۔ اس کا گھر بھی ... انداز میں بنا ہوا تھا۔ میں نے مسروقہ صندوق کی تفصیل ... اس نے بتایا۔

"وہ چھوٹے سائز کا ایک جستی ٹرنک تھا۔ چوڑائی ڈیڑھ ... لمبائی ڈھائی فٹ رہی ہوگی۔ اس ٹرنک پر ایک مضبوط ... لگا ہوا تھا۔"

"ڈاکوؤں کے لیے تالے اور کنڈیاں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔" میں نے کہا "وہ صندوق پر لگے ہوئے تالے کو کھولنے کے بجائے توڑنا مناسب سمجھیں گے۔ یہ ان کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہوگا۔"

"صندوق اور وہ زیورات جائیں جہنم میں۔" وہ شکستہ لہجے میں بولا "میں رانی کے لیے بہت فکرمند ہوں۔ پتا نہیں ڈاکو اسے کہاں لے گئے ہیں اور اس کے ساتھ کیسا سلوک..." وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر دکھی نظر سے مجھے دیکھنے لگا پھر بولا "میں بڑے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ بڑے چاؤ سے میں اس کی بیٹی بیاہ کر لایا تھا لیکن رانی کو میرے گھر کی بہو بننا نصیب نہیں ہوا۔ پتا نہیں کس دشمن کی نظر کھاگئی ہماری خوشیوں کو؟"

بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی اور وہ خاموش ہوگیا۔ مجھے گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے ایک اشارہ مل گیا تھا۔ میں نے اس سرے کو پکڑ لیا اور خدا بخش سے پوچھا۔

"میں بھی تو اسی دشمن کی تلاش میں ہوں۔ تمہارے خیال میں تم لوگوں کی خوشیوں کو کس بدبخت کی نظر لگی ہوگی؟"

"آں......!" اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور جلدی سے بولا۔ "میں نے تو ایسے ہی ایک بات کہہ دی تھی۔ میرے ذہن میں کسی دشمن کا نام یا چہرہ نہیں ہے۔"

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا "تم نے ایسے ہی ایک بات کہہ دی تھی مگر میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں' اچھی طرح سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ یہ ڈاکوؤں کی معمول کی کارروائی نہیں ہوسکتی۔ اس سازش کے پیچھے یقیناً تمہارے کسی دشمن کا ہاتھ ہے اور اس دشمن شخص تک تم مجھے پہنچاؤ گے؟"

"میں کسی ایسے شخص سے واقف نہیں جو اس حد تک مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرسکتا ہو۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرا جوان جہان بیٹا موت کے منہ میں چلا گیا۔ بھائی کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا کر لے گئے۔ اللہ بخش نے کتنی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے رانی کو میری بہو بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اوہ! سب کچھ تباہ ہوگیا۔"

خدا بخش کے آخری جملے نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا "تم کن مشکلات کا ذکر کررہے ہو؟"

وہ فوراً میرے سوال کی تہہ میں پہنچ گیا' ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا "اللہ بخش کی بیوی یعنی رانی کی ماں اس رشتے کے لیے تیار نہیں تھی مگر اللہ بخش نے اپنی بیوی خدیجہ کی ایک نہ سنی اور اپنی بات منوا کر دکھائی لیکن شاید قدرت کو اللہ بخش کی یہ ضد اور زبردستی پسند نہیں آئی اور......" وہ ایک مرتبہ پھر

افسوسناک انداز میں گردن جھٹکنے لگا۔ "اُفوہ...... سب کچھ الٹا ہوگیا۔ دونوں گھر اجڑ گئے۔ میرا بیٹا اور اللہ بخش کی بیٹی بھی......"

اس نے ادھورے جملے پر اپنی بات کو اختتام دیا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "خدا بخش! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک بھائی اپنی بیٹی دوسرے بھائی کے بیٹے کو دے رہا تھا۔ اس میں خدیجہ کے اعتراض کا کون سا پہلو نکلتا ہے۔ وہ اس رشتے کی مخالفت کیوں کر رہی تھی۔ کیا وہ آپ لوگوں کو اپنا دشمن سمجھتی ہے؟"

"ایسی بات نہیں جناب!" خدا بخش تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "ہم اس کے دشمن ہیں اور نہ ہی وہ ہمیں اپنا دشمن سمجھتی ہے۔"

میں الجھ کر رہ گیا۔ "پھر کیسی بات ہے خدا بخش؟" میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ "اگر تمہاری بات کو درست مان لیا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے خدیجہ اس رشتے کی مخالفت کیوں کر رہی تھی؟"

"وہ...... وہ دراصل بات یہ ہے جناب......!" خدا بخش نے اٹکتے ہوئے بتایا۔ "خدیجہ چاہتی تھی کہ اپنی بیٹی رانی کی شادی بھائی کے بیٹے بشارت سے کرے مگر اللہ بخش کی نظر میں بشارت کوئی اچھا لڑکا نہیں۔ پھر اپنے سالے الیاس سے بھی اللہ بخش کے تعلقات خوشگوار نہیں ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو بالکل پسند نہیں کرتے۔"

خدا بخش کے انکشاف نے مجھے بہت دور تک سوچنے کی راہ دکھا دی۔ مغوی رانی کی ماں اپنے بھتیجے بشارت سے اس کی شادی کرنا چاہتی تھی لیکن شوہر نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ اللہ بخش کے اپنے سالے الیاس سے اچھے تعلقات نہیں تھے اور وہ بشارت کو بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں ایک کردار بشارت کا نام ذہن میں چمکتا تھا۔ میں نے اس صورتِ حال کو واضح کرنے کے لیے خدا بخش سے پوچھ لیا۔

"کیا رانی کی شادی بشارت سے کرنے کی خواہش صرف خدیجہ کی تھی یا اس کا بھائی الیاس بھی اس رشتے میں دلچسپی رکھتا تھا؟"

اس نے بتایا۔ "الیاس اگرچہ اللہ بخش کو زیادہ پسند نہیں کرتا لیکن وہ اس رشتے کی مخالفت میں بھی نہیں تھا۔ اگر اللہ بخش بیوی کی بات مان لیتا تو الیاس اپنی چھوٹی بہن کی خوشی کی خاطر اس رشتے سے انکار نہ کرتا۔"

"اور بشارت...... کے بارے میں کیا کہتے ہو؟" میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

"وہ بھی رانی کو پسند کرتا تھا۔" خدا بخش نے بتایا۔

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور پوچھا۔ "ا
کی رہائش کہاں پر ہے؟"

"چک بتیس میں۔" خدا بخش نے جواب دیا۔

"اوہ!" میں ایک مرتبہ پھر گہری سانس لے کر رہ گ
استفسار کیا۔ "کیا الیاس یا اس کے گھر کا کوئی فرد اس شادی
شریک ہوا تھا؟"

"نہیں انہوں نے اس شادی کا مکمل بائیکاٹ کیا
دو بیزاری سے بولا۔ "اور لگتا ہے اب ان دونوں خاندانوں
فاصلے اور زیادہ بڑھ جائیں گے۔"

"الیاس کی براہِ راست تم سے تو کوئی دشمنی نہیں
نا؟"

"ہمارے درمیان کبھی میل جول نہیں رہا۔" خدا
نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "دوستی یا دشمنی کا کوئی سوال
پیدا نہیں ہوتا۔"

"لیکن تمہارے بیٹے کا قتل تو ایک خطرناک دشمنی
طرف اشارہ کر رہا ہے!" میں نے معنی خیز انداز میں ا
آنکھوں میں جھانکا۔

"آپ...... آپ کیا کہنا چاہتے ہیں!" اس کی آنکھیں
حیرت سے پھیل گئیں۔

میں نے حالات کے اندھیرے میں اندازے کا
تیر پھینکا تھا۔ خدا بخش کے چونکنے نے مجھے مزید کھیلنے پ
اور میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم میری باتوں سے کیا سمجھ رہے ہو؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "آپ کے انداز سے
لگتا ہے کہ آپ الیاس کو اس واقعے کا ذمے دار سمجھ رہے ہیں"

"الیاس یا بشارت...... ایک ہی بات ہے!"

"مم...... مگر وہ اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتے ہیں؟" اس
حیرت بڑھتی ہی جارہی تھی۔

میں نے کہا۔ "میں حتمی طور پر کوئی فیصلہ صادر نہیں
ہوں مگر حالات و واقعات اسی جانب اشارہ کر رہے ہیں۔"

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تھانے
صاحب! مجھے اپنی قبر میں جانا ہے اور مرنے کے بعد
جواب بھی دینا ہے اس لیے میں بغیر ثبوت کے کسی پر شک
کر کے اپنی عاقبت آخرت کو خراب نہیں کرنا چاہتا۔"

"خدا بخش!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہ
کہا۔ "شک ہمیشہ بغیر ثبوت کے ہی کیا جاتا ہے۔ اگر ثبوت
مل جائے تو پھر یہ شک یقین کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔"

وہ سہمی ہوئی خاموش نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "خدا بخش! تمہارا جوان بیٹا قتل ہوگیا۔ تمہاری بہو کو زیورات والے صندوق سمیت ڈاکو اٹھا لے گئے۔ برات میں موجود کسی مرد و زن کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا۔ صرف ان افراد کو شدید زخمی کر کے مزاحمت کے قابل نہیں چھوڑا گیا جو مسلح تھے اور ڈاکوؤں کی کارروائی میں کوئی رخنہ ڈالنے کی طاقت رکھتے تھے۔ اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے!" میں تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکو اس برات اور اس میں شامل ہر شے سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہوں نے باقاعدہ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت یلغار کی اور اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان حالات و واقعات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکوؤں کو یہ شادی ہرگز ہرگز پسند نہیں آئی تھی۔ تم کیا کہتے ہو؟"

وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں آپ کی باتوں سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہ وزن سے خالی نہیں ہیں لیکن ڈاکوؤں کی یہ دشمنی سمجھ میں نہیں آرہی۔ وہ میرے یا اللہ بخش سے کیوں انتقام لیں گے۔ ہم نے آخر ان کا کیا بگاڑا ہے؟"

اس کی سوچ کی حد کو دیکھتے ہوئے میں نے اس موضوع کو زیادہ پھیلانا ضروری نہ سمجھا اور کہا۔ "خدا بخش! تم فکر نہ کرو۔ میں جلد از جلد اس ڈاکو گروہ کو ڈھونڈ نکالوں گا اور انہیں عدالت سے عبرتناک سزائیں دلواؤں گا۔ تمہیں اس سلسلے میں اگر کوئی اہم یا غیر اہم بات پتا چلے تو فوراً مجھے بتانا۔ یقیناً تم بھی یہی چاہو گے کہ تمہارے بیٹے کے قاتل اور بہو کو اغوا کرنے والے سلاخوں کے پیچھے نظر آئیں!"

"جی...... جی ہاں۔" وہ تیزی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"خدا بخش کا جوان بیٹا قتل ہوگیا تھا اور وہ بھی ایسے موقع پر کہ مقتول ابھی تک دولہا کے روپ رنگ میں تھا۔ عارف نے بھی عجب نصیب پایا تھا۔ وہ بیوی والا تو ہوگیا تھا مگر اس بیوی پر کوئی بھی حق جتانے سے پہلے موت اپنا حق وصول کرنے اس کے سر پر آن پہنچی تھی۔

موت ایک سفاک اور سنگین حقیقت کا نام ہے۔ یہ اٹل ہے اور اس کے مقررہ وقت کا ایک لمحہ بھی ادھر سے ادھر نہیں سرک سکتا۔ یہ اگر انسانوں کی خوشیوں کو دیکھنے اور مجبوریوں کو ناپنے بیٹھ جائے تو پھر اپنے کام کی نہیں رہتی۔ اسے تو ہر صورت میں اپنا فرض نبھانا ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ خوشیوں کے میلے میں سے اپنے مطلوب کو اٹھا لے جاتی ہے۔ شاید اسی لیے شہنائی اور ماتم لازم و ملزوم سمجھے جاتے ہیں۔ انسانی زندگی غم و خوشی کا ایک مرقع ہے!

خدا بخش کو میں نے فارغ کر دیا۔ باقی باتیں بعد میں بھی پوچھی جا سکتی تھیں۔ ویسے اس کی فراہم کردہ اطلاعات نے میرے ذہن میں تفتیش کا ایک نیا دریچہ وا کر دیا تھا۔ میں بشارت اور اس کے والد الیاس کو کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس شادی نے سب سے زیادہ تکلیف انہی کو پہنچی تھی۔ اگلی صبح میں نے انہیں چیک کرنے کا فیصلہ کیا اور دیگر لوگوں کے بیانات قلم بند کرنے میں مصروف ہوگیا۔

اس سلسلے میں حوالدار خیر خان نے میری بھرپور مدد کی۔ ہم نے ایک گھنٹے میں ڈیڑھ درجن افراد کے بیان نوٹ کیے۔ ان میں مرد و زن سب شامل تھے۔ یہ تمام افراد برات کے ساتھ تھے۔ اس عرق ریزی سے کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی البتہ سلمیٰ نامی ایک عورت نے ایک خاص زاویے کی طرف میری توجہ مبذول کرائی۔ سلمیٰ خدیجہ کی چھوٹی بہن تھی اور بھانجی رانی کے ساتھ ہی چک بتیس سے چک چوراسی پہنچی تھی۔ سلمیٰ کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بیوہ تھی۔ اس کا اکلوتا بیٹا منصور بھی اس کے ہمراہ تھا۔ منصور کی عمر چودہ سال کے قریب تھی اور وہ ایک ایب نارمل لڑکا تھا۔ خاندان بھر میں وہ منصور جھلا کے نام سے مشہور تھا۔ سلمیٰ اپنے بیٹے کے ساتھ موضع شاہکوٹ میں رہتی تھی اور شادی میں شرکت کے لیے چک بتیس آئی تھی۔

سلمیٰ اپنی بھانجی رانی کے اغوا کی وجہ سے بہت پریشان نظر آتی تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی اور وہ یہ کہ چک بتیس سے تعلق رکھنے والے افراد اس واردات کو دولہا کے کسی دشمن کا کارنامہ قرار دے رہے تھے اور چک چوراسی والوں کا یہ خیال تھا کہ دولہا پر یہ مصیبت دوسری طرف سے آئی تھی تاہم کوئی بھی کسی واضح دشمن کی طرف اشارہ نہیں کر رہا تھا۔

اس سلسلے میں سلمیٰ نے ایک قدرے مختلف بات کی۔

"تھانے دار صاحب!" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو یہ لگتا ہے، عارف کے کسی دشمن نے اسے چوٹ دی ہے۔"

"ایسی باتیں تو اور لوگ بھی کر رہے ہیں۔" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن ایسا دشمن کون شخص ہو سکتا ہے یہ کوئی نہیں بتاتا۔ یہ تو ایک چھوٹا سا بچہ بھی بتا سکتا ہے کہ کوئی دوست اس نوعیت کی لوٹ مار اور قتل و غارت گری نہیں کر سکتا۔ ڈاکوؤں کی صورت میں جو کوئی بھی تھا وہ دشمن ہی ہو سکتا تھا...... دولہا کا دشمن ہو یا دلہن کا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا!"

"میں جس شخص کے بارے میں آپ کو بتانا چاہتی

PDF LIBRARY 0333-7412793

ہوں ماضی میں عارف کے ساتھ اس کا جھگڑا بھی رہا ہے۔" سلمیٰ نے دھیمے اور پُراسرار انداز میں انکشاف کیا۔

میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ سلمیٰ کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اسے بیوہ ہوئے لگ بھگ دس سال ہوئے تھے۔ اس عمر میں بھی وہ خاصی فٹ تھی۔ شکل و صورت اچھی ہو تو گزرتے ہوئے ماہ و سال عورت کو زیادہ متاثر نہیں کرتے۔ کم اولاد کے باعث بھی اس کا رنگ روپ جوبن پر رہتا ہے۔ سلمیٰ کو یہ تمام پلس پوائنٹ حاصل تھے۔

میں نے ایک لمحے میں اس کے سراپا کا بھرپور جائزہ لیا اور اگلے ہی لمحے سوال داغ دیا "تم مجھے کس شخص کے بارے میں بتانا چاہتی ہو؟"

"اس کا نام مہر مشتاق ہے۔" وہ بدستور پُراسرار انداز میں بولی۔

"مشتاق؟" میں نے بے ساختہ دہرایا "یہ شخص کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟"

"مہر مشتاق کا تعلق قصبہ سلطان پورہ سے ہے۔" اس نے بتایا۔

سلطان پورہ کے ذکر پر میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یہ قصبہ جائے واردات سے جنوبی سمت میں واقع تھا۔ واردات کے چشم دید براتیوں کے مطابق ڈاکو اسی جانب جنگل میں غائب ہوئے تھے۔ اس طرف لگ بھگ ڈھائی میل تک گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ جنگل سے نکلنے کے بعد تین ساڑھے تین میل کے فاصلے پر قصبہ سلطان پورہ واقع تھا۔ ان واقعاتی حقائق کی روشنی میں سلمیٰ کی بات سن کر میرا چونک جانا لازمی امر تھا۔ میں نے اضطراری انداز میں اس سے پوچھا۔

"سلمیٰ! تم نے بتایا ہے ماضی میں مہر مشتاق اور مقتول عارف کے درمیان کوئی جھگڑا وغیرہ بھی رہا ہے۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا وہ جھگڑا کس نوعیت کا تھا اور اس کا سبب کیا تھا؟"

"زمینداروں کے بیچ لڑائی جھگڑے کی سب سے بڑی وجہ زمین ہی ہوتی ہے۔" وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولی "زیادہ تفصیل کا تو مجھے پتا نہیں لیکن اڑتی اڑتی سنی تھی مہر مشتاق اور عارف کے درمیان بھی کوئی زمینی تنازع ہی تھا۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگی۔

"مہر مشتاق قصبہ سلطان پورہ کے ایک بڑے زمیندار مہر یوسف کا بیٹا ہے۔ وہ لوگ وہاں کے طاقتور افراد ہیں۔ مشتاق کے دادا کا نام سلطان تھا۔ وہ قصبہ مہر سلطان کے نام ہی سے مشہور ہے۔ اس سے آپ مہر خاندان کے اثر و رسوخ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔"

سلمیٰ کی باتیں توجہ طلب اور فکر انگیز تھیں۔ اگر واقعی مہر مشتاق اور عارف کے درمیان کوئی سنجیدہ دشمنی موجود تھی تو پھر اس واردات کو مشتاق کے ساتھ منسوب کرنے کا جواز بنتا تھا۔ مہر مشتاق، عارف سے ایک بھیانک انتقام لینے کے لیے خود یا پھر ڈاکوؤں کی مدد سے اس قسم کی کارروائی کروا سکتا تھا۔ اس دشمنی کی حقیقت کی تصدیق یا تردید خدا بخش کر سکتا تھا۔

میں نے مختلف زاویوں سے سلمیٰ کو مزید سمجھنے کی کوشش کی لیکن مجھے اس سلسلے میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس نے یہ کہہ کر بات ہی ختم کر دی۔

"تھانے دار صاحب! مجھے جو کچھ معلوم تھا، وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔ یقین کریں یا نہ کریں، آپ کی مرضی ہے۔"

میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہہ دیا "تم فکر نہ کرو۔ میں اس کیس کی تفتیش کے دوران میں مہر مشتاق اور اس کے باپ مہر یوسف کو چیک کروں گا۔ تم نے ایک مفید اشارہ دیا ہے۔ قانون سے اس تعاون کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" پھر تھوڑا توقف کر کے میں نے اس سے پوچھا۔

"تم موضع شاہ کوٹ میں کس طرف رہتی ہو؟"

اس نے مجھے اپنے گھر کی لوکیشن تفصیل سے بتا دی۔ سردار علی کی وفات کے بعد اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی اور بیوگی کا یہ تمام تر عرصہ اپنے ایب نارمل بیٹے منظور جھلا کے ساتھ گزار دیا تھا۔ سردار علی اپنے پیچھے اچھی خاصی زمین چھوڑ گیا تھا لہٰذا وہ کسی قسم کے مالی یا معاشی مسائل کا شکار نہیں ہوئی۔ سلمیٰ منظور جھلا کے ساتھ بڑے مزے اور آسانی سے زندگی گزار رہی تھی۔ میں نے اسے فارغ کرنے کے بعد دوبارہ خدا بخش سے بات کی۔

"خدا بخش! مجھے پتا چلا ہے، تمہارے مقتول بیٹے کا کسی مہر مشتاق سے کوئی پھڈا رہا ہے؟"

"یہ بات آپ کو کس نے بتائی ہے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

"کسی نے بھی بتائی ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا "تم میرے سوال کا جواب دو۔"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "بات بہت معمولی سی تھی مگر جوان خون اور جوش سے بھرے ہوئے دماغوں نے اسے جھگڑے کا رنگ دے دیا۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا "زمینداروں کے بیچ ایسے چھوٹے موٹے تنازعات تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ ہمارے درمیان بھی نہری پانی کی ترسیل اور تقسیم کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مہر مشتاق اور عارف دونوں ابھرتے ہوئے جوان تھے۔ ان کے درمیان تلخ کلامی ہو گئی۔ ازاں بعد یہ تلخ کلامی مختلف قسم کی دھمکیوں تک جا پہنچی تھی۔ بہرحال!" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک گہری سانس لی اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "میں نے مہر یوسف کے ساتھ مل کر سارے معاملات طے کر لیے اور یہ فتنہ اسی طرح بیٹھ گیا جیسے اچانک کھڑا ہو گیا تھا۔ اب تو اس واقعے کو کئی ماہ گزر چکے ہیں۔ میں تو اس تنازع کی ساری تلخی کو بھول گیا ہوں۔"

میں نے اس کی وضاحت پوری توجہ سے سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا "خدا بخش! تم تو اس تلخی کو فراموش کر بیٹھے ہو لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے، مہر یوسف اور اس کے بیٹے مہر مشتاق نے بھی تمہاری طرف سے اپنے دل صاف کر لیے ہوں!"

"تھانے دار صاحب! دلوں کے حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔" خدا بخش نے مضبوط لہجے میں کہا "اس سلسلے میں کوئی گارنٹی کیسے دی جا سکتی ہے۔ ویسے میرا خیال ہے، وہ لوگ بھی اس جھگڑے کو بھلا بیٹھے ہوں گے ورنہ اس دوران میں کوئی نہ کوئی ناخوشگوار واقعہ ضرور دیکھنے یا سننے میں آتا۔"

"ڈاکوؤں کی اس واردات کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

"میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں!"

"میں نے کوئی بھی مشکل یا الجھی ہوئی بات نہیں کی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ڈاکوؤں والی کارروائی کے پیچھے مہر خاندان کا ہاتھ بھی تو ہو سکتا ہے!"

"سوہنا خدا ہی بہتر جانتا ہے تھانے دار صاحب!" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا "میں جوان بیٹے کی اندوہناک موت اور بہو کے اغوا کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔ سچ پوچھیں تو میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔ میں نے آپ کو تمام حالات تفصیل سے بتا دیے ہیں۔ آپ چاہے جیسے بھی تفتیش کو آگے بڑھائیں، میں تو یہ چاہتا ہوں، رانی کو جلد از جلد ڈاکوؤں کے چنگل سے آزاد کرا دیں اور میرے عارف کے قاتلوں کو بھیانک سزائیں دلوائیں۔ اگر...... اگر......" وہ کچھ کہتے کہتے اٹکا پھر تھوڑے توقف کے بعد بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

"اگر رانی ڈاکوؤں کے قبضے سے واپس نہ لائی گئی تو میں اللہ بخش سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکوں گا۔ رانی کا نکاح تو عارف سے ہوا تھا لیکن اللہ بخش نے بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا تھا...... میں رانی کو تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ اب تم ہی اس کی حفاظت کرنا اور میں...... میں اس کی حفاظت نہیں کر سکا۔ افسوس......"

اس کا گلا رندھ گیا۔ میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا "تم فکر نہ کرو خدا بخش، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہارے مقتول بیٹے کو تو واپس نہیں لا سکتا لیکن وعدہ کرتا ہوں، تمہاری بہو کو ضرور ڈاکوؤں کے قبضے سے نکال لاؤں گا۔ تمہیں اپنے بڑے بھائی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔" پھر میں نے اس کی دل گرفتگی کو کم کرنے کی خاطر قدرے شگفتہ لہجے میں کہا۔

"ویسے تم دونوں بھائیوں کے ناموں میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ بڑے ہم وزن اور ہم معنی ہیں۔"

وہ آنکھوں میں اتر آنے والی نمی کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بولا "ہمارے ابا مرحوم کو سوہنا رب کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ وہ کہا کرتے تھے، اس کائنات میں پائی جانے والی تمام چیزیں اسی قادرِ مطلق کی ہیں لہٰذا ان کے نام کے انتخاب کے سلسلے میں اس تعلق کو ضرور ذہن میں رکھنا چاہیے۔"

ایک سیدھے سادے ان پڑھ دیہاتی نے بڑی پتے کی بات کی تھی۔ اگر اس نکتے کو ہم ذہن نشین کر لیں تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ خالق اور مخلوق کے درمیان تعلق کی ڈوری کو قائم اور سلامت رہنا چاہیے چاہے یہ تعلق معانی کے اعتبار سے ہو یا کسی اور وصف کے طفیل...... کل اور جز کا رشتہ بہر صورت استوار رہنا چاہیے۔

میں نے خدا بخش کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تسلی آمیز انداز میں کہا "زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم ہی ہوش و حواس کھو بیٹھے تو تمہاری بیوی کو کون سنبھالے گا۔ جوان بیٹے کی موت نے ماں کے سینے میں جو قیامت برپا کی ہوگی اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔"

"نصیباں اپنے حواس کھو بیٹھی ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ نصیباں بی بی مقتول دولہا کی ماں کا نام تھا "وہ تھوڑی دیر کے لیے ہوش میں آتی ہے اور پوچھتی ہے میری بہو کہاں ہے؟ پھر عارف کو پکارتی ہے، اوڈے پتر! اپنی ووہٹی کو تو میرے پاس لاؤ۔ اس کے بعد سینہ کوبی کرتے ہوئے دوبارہ غشی کی حالت میں چلی جاتی ہے۔"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، تم خود پر قابو رکھو تاکہ دوسروں کو سنبھال سکو۔ مجھے قانونی کارروائی کے لیے دو راستے مل گئے ہیں۔ ان شاء اللہ انہی راستوں پر چلتے ہوئے میں بہت جلد منزل پر بھی پہنچ ہی جاؤں گا۔"

"کون سے دو راستے؟" خدا بخش نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میں نے مختصر الفاظ میں اسے مہر مشتاق اینڈ کمپنی اور بشارت اینڈ کو کے بارے میں بتا دیا۔

وہ بولا "تھانے دار صاحب! آپ اپنے کام کو زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ میں کسی کو الزام نہیں دوں گا۔"

"خدا بخش! پولیس کی تفتیش جس گاڑی میں آگے بڑھتی ہے وہ شک کے ایندھن سے چلتی ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے بعد شک کو بنیاد بنانا پڑتا ہے اور فی الحال اس واردات کے حوالے سے یہی دونوں پارٹیاں مشکوک ٹھہرتی ہیں۔" میں نے سانس لینے کے لیے ذرا سی خاموشی اختیار کی اور مزید کہا "خاص طور پر سلطان پورہ کا رہائشی مہر مشتاق میرا خصوصی نشانہ ہے کیونکہ عینی شاہدین کے مطابق ڈاکو واردات کے بعد جنوبی سمت میں فرار ہوئے تھے اور تم جانتے ہو اس طرف جنگل کے پار موضع سلطان پورہ واقع ہے!"

وہ خالی نظر سے مجھے تکتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگا۔

میں اس کے گھر سے نکل کر تھانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

اصول تو یہ ہے کہ اگر رات کو سونے میں تاخیر ہو جائے تو اگلی صبح آنکھ دیر سے کھلتی ہے مگر یہ اصول اس بات کا متقاضی ہے کہ بستر پر جاتے وقت آپ کا ذہن روزمرہ کے جنجال کو نمٹا چکا ہو۔ میرے ساتھ ایسی کوئی سہولت نہیں تھی۔ میں ایک بے حد الجھی ہوئی صورت حال کو ذہن میں بٹھا کر سویا تھا لہٰذا آئندہ صبح معمول سے بھی پہلے ہی میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے اپنی عادت کے مطابق نہا دھو کر نماز فجر ادا کی اور ناشتے وغیرہ سے نمٹ کر تیار ہو گیا۔ رات تھانے سے اپنے کوارٹر کی طرف آتے ہوئے میں نے کانسٹیبل منظور علی کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ علی الصباح دین محمد کو لانے کے لیے روانہ ہو جائے۔

دین محمد عرف بابا دینا ایک تجربہ کار کھوجی تھا۔ میں اس سے مختلف مواقع پر نہایت ہی مفید اور نتیجہ خیز کام لے چکا تھا۔ کھوجی بابا دینا کو میں اپنے ساتھ جائے وقوعہ پر لے جانا چاہتا تھا تاکہ ڈاکوؤں کا سراغ لگانے کے لیے ان کا کھرا اٹھایا جا سکے۔ دین محمد کو اپنے پیشے میں بے حد مہارت حاصل تھی۔

میں یونیفارم پہن کر قبل از وقت تھانے پہنچا تو مجھے معلوم ہوا، منظور علی میری ہدایات کی تکمیل کے لیے علی الصباح تھانے سے نکل گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر تھانے کا عملہ اٹین شن ہو گیا۔ رات کو جو پارٹی میں نے ڈاکوؤں کی تلاش میں جنگل کی طرف بھیجی تھی، وہ واپس آ چکی تھی۔ پارٹی کے لیڈر نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ ڈاکوؤں کے کسی گروہ کا سراغ لگانے میں ناکام رہے تھے۔

"تم نے جنگل کے کس کس حصے میں ڈاکوؤں کو تلاش کیا؟" میں نے پولیس پارٹی کے سرکردہ اہل کار سے دریافت کیا۔

اس نے بتایا "ملک صاحب! ہم نے اس جنگل کے جنوبی حصے کو کھنگال ڈالا ہے لیکن کہیں بھی ہمیں ڈاکو یا ان کے آثار نظر نہیں آئے۔"

"کیا تم لوگوں نے جنگل کے شمالی حصے کو بھی چیک کیا؟" میں نے پوچھا۔

جنگل کے شمالی اور جنوبی حصے سے مراد وہ علاقہ تھا جو گزرگاہ کے شمال اور جنوب میں واقع تھا۔ یہ راستہ تقریباً جنگل کے درمیان سے گزرتا تھا۔ مذکورہ جنگل کا رقبہ کم و بیش چار ضرب ساڑھے پانچ میل پر پھیلا ہوا تھا۔ اس راہ گزر سے شمال میں تین میل اور جنوب میں لگ بھگ ڈھائی میل، مشرق سے مغرب کی سمت اس کی طوالت چار میل کے قریب تھی۔

پارٹی لیڈر نے میرے سوال کے جواب میں بتایا "ملک صاحب! ڈاکوؤں نے واردات کے بعد چونکہ جنگل کی جنوبی سمت رخ کیا تھا اس لیے ہم اسی حصے کی خاک چھانتے رہے۔ شمال والے حصے میں ہم نہیں گئے۔"

یہ پارٹی مجھ سے کافی پہلے اس طرف روانہ ہوئی تھی۔ اگر وہ لوگ جنگل کے شمالی حصے میں داخل ہوتے تو یقیناً ململ کا سفید دوپٹا ان کی نظر سے اوجھل نہ رہتا جو کانسٹیبل نے ایک درخت کے تنے سے کھولا تھا۔ میں نے آئندہ پندرہ منٹ میں دو تین نہایت ہی اہم کام انجام دیے۔

سب سے پہلے میں نے اے ایس آئی ظاہر کو تھانے سے روانہ کر دیا۔ ظاہر علی کو کئی کام کرنا تھے۔ اسے علاقے کے ایس پی کو اس واردات کی اطلاع دینے کے بعد سیدھا چک بتیس پہنچنا تھا۔ چک بتیس میں دلہن رابعہ عرف رانی کے گھر والوں کو اس واقعے سے باخبر کرنے کے ساتھ ساتھ اسے الیاس اور بشارت کی سن گن بھی لینا تھی۔ میں نے اس حوالے سے ظاہر علی کو بریف کر دیا۔ اسے متعلقہ افراد کو ٹچ کیے بغیر ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں۔ میں الیاس اور بشارت کی بے خبری میں ان پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔ اگر ان لوگوں کا اس واردات سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق تھا تو پھر

وہ کسی بھی سرگرمی سے فوراً محتاط ہو جاتے اور یہی میں نہیں چاہتا تھا۔ ہوشیار اور محتاط شکار کو دام میں لانا بہت مشکل ہوتا ہے!

ظاہر علی تھانے سے روانہ ہو گیا تو میں نے دو کانسٹیبلوں کو اپنے کمرے میں بلا لیا اور خصوصی ہدایات دینے کے بعد انہیں سلطان پورہ کی جانب روانہ کر دیا۔ ان میں ایک تو منظور علی تھا اور دوسرا آفتاب احمد۔ ان دونوں کو سادہ لباس میں رہتے ہوئے سلطان پورہ میں مہر مشتاق وغیرہ کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنا تھی اور جیسے ہی وہ کوئی غیر معمولی بات نوٹ کرتے، ان میں سے ایک تھانے آ کر فوراً مجھے مطلع کر دیتا۔ اگر مہر خاندان کا اس واردات میں ہاتھ تھا تو کوئی نہ کوئی "مفید" بات جلد ہی منظر عام پر آ جاتی ...... اور جیسے ہی یہ مفید بات میرے علم میں آتی، میں فوراً حرکت میں آ جاتا۔ یہی پلاننگ ظاہر علی کے حوالے سے بھی تھی۔

میں اس کام سے فارغ ہوا تو کھوجی بابا کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ تھوڑی دیر پہلے منظور علی اسے اپنے ساتھ تھانے لایا تھا۔ وہ میرے کمرے میں آتے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"جی تھانے دار صاحب! کیا حکم ہے؟ میں نے آپ کے بھیجے ہوئے سپاہی کو بہت کریدا ہے لیکن اس نے کوئی سرا نہیں پکڑایا۔ شاید اس سلسلے میں آپ نے خصوصی تاکید کر رکھی تھی۔ ویسے آپ کا سپاہی بڑا پکا بندہ ہے!"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا "تم ایک سرے کی کیا بات کرتے ہو بابا! میں تو پورا معاملہ ہی تمہارے سامنے کھول رہا ہوں۔"

"جی حکم سرکار!" وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

میں نے پوچھا "تمہیں پتا تو چل گیا ہو گا کہ پچھلی رات ادھر جنگل میں ایک خوفناک واردات ہو گئی ہے؟"

"جی سرکار!" اس نے پرمعنی انداز میں اپنی گردن کو جنبش دی "میں نے اس واقعے کے بارے میں سنا ہے۔ ڈاکوؤں کے کسی گروہ نے ایک برات پر ہلا بول کر بڑی تباہی مچائی ہے اور جاتے ہوئے دلہن کو بھی اغوا کر لیا ہے۔ دولہا کو وہ گولیوں سے بھون کر وہیں پھینک گئے ہیں۔"

"تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے بابا دین۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "ہمیں ڈاکوؤں کے اسی گروہ کا سراغ لگانا ہے تاکہ ان کے قبضے سے دلہن کو چھڑایا جا سکے۔ اس سلسلے میں مجھے تمہارے ماہرانہ تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم ابھی جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہونے والے ہیں۔ تم ڈاکوؤں کا کھرا اٹھاؤ گے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو گے کہ وہ کہاں سے آئے تھے اور کہاں گئے ہیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور بولا "بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں حضور۔"

"تو پھر تم دس منٹ کے اندر ضروری تیاری کر لو۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

اس کے بعد میں نے حوالدار خیر خان کو اپنے پاس بلا لیا اور اسے ضروری ہدایات دینے لگا۔ میری غیر موجودگی میں اسے تھانے کا نظام سنبھالنا تھا اور وہ اس کا اہل تھا۔

لگ بھگ آٹھ بجے صبح ہم تھانے سے روانہ ہوئے۔ یہ خاصا جلدی تھا۔ ان دنوں میں نو بجے تھانے پہنچتا تھا، اس کے بعد ہی تھانے داری شروع ہوتی تھی۔ موسم خوشگوار سے چار ہاتھ آگے بڑھ کر اچھا خاصا ٹھنڈا تھا۔ چند روز بعد موسم سرما کا آغاز ہونے والا تھا۔ ہم اس وقت گھوڑوں پر سوار تھے اور موسم کی مناسبت سے ہم نے مناسب لباس زیب تن کر رکھے تھے۔ میں نے قدیر نامی ایک کانسٹیبل کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔

ہمارے گھوڑے سبک رفتاری سے چلتے ہوئے جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ میں گزشتہ رات بھی یہاں کا "دورہ" کر کے جا چکا تھا لیکن وہ جائے واردات کا سرسری اور ادھورا جائزہ تھا اور اب میں مکمل کارروائی کے لیے وہاں پہنچا تھا۔ ہم نے اپنے گھوڑوں کو درختوں سے باندھ دیا اور اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد میں نے جائے وقوعہ پر ضابطے کی کارروائی مکمل کر لی۔ مشیر نامہ تیار کرنے میں کانسٹیبل قدیر نے میری بھرپور مدد کی۔ اس کارروائی کے دوران میں میں نے اس درخت کا بھی تنقیدی جائزہ لیا جس کے تنے سے گزشتہ رات ململ کا سفید دوپٹا بندھا ہوا ملا تھا۔ میں نے رات موقع واردات سے روانہ ہوتے وقت مذکورہ درخت کے تنے کے ساتھ زمین پر ایک بڑا پتھر رکھ دیا تا کہ نشان رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

الغرض اس تمام تر کارروائی کے نتیجے میں میں ڈاکوؤں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کوئی مفید سراغ حاصل نہ کر سکا۔ کھوجی بابا دین محمد میرے پاس آیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

"ملک صاحب! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اپنا کام شروع کر دوں!"

اس کے انداز میں بڑا واضح جوش پایا جاتا تھا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا اور تیز لہجے میں کہا "یہ کام تو تم اجازت حاصل کیے بغیر ہی شروع کر چکے ہو!"

وہ ٹھٹک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں اپنی کارروائی کے دوران میں مسلسل دین محمد پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا اور میں نے اس عرصے میں اسے مصروفِ عمل پایا تھا۔ وہ راہ گزر کی شمالی اور جنوبی دونوں سمت اپنی مہارت کو آزمانے میں لگا رہا تھا اور اس وقت میں اس کے چہرے پر جو رنگ دیکھ رہا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا' وہ کوئی اہم بات جاننے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"لگتا ہے تم نے کوئی خاص نکتہ پکڑ لیا ہے!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفساریہ لہجے میں کہا۔

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ دین محمد عرف بابا دینا نے ڈاکوؤں کے گھوڑوں کا کھرا تلاش کر لیا تھا۔ وہ راہ گزر کی جنوبی سمت جنگل کی زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"دیکھیں' یہاں سے بارہ گھڑ سوار جنگل کے اس حصے میں داخل ہوئے ہیں۔"

"بارہ گھڑ سوار؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں دوہرایا۔

"جی ہاں' میں بارہ گھوڑوں کے سموں کے نشانات کو جنگل کے اس حصے کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔" وہ پُروثوق انداز میں بولا "میرا برسوں کا تجربہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا سرکار۔"

"دین محمد!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "کوئی چار درجن براتیوں نے چھ گھڑ سوار ڈاکوؤں کی گواہی دی ہے۔ تعداد کے سلسلے میں ان سب کا بیان تضاد سے پاک ہے اور تم......" میں بات نامکمل چھوڑ کر تھوڑا متوقف ہوا پھر مزید کہا۔

"تم بارہ گھڑ سواروں کی نئی کہانی سنا رہے ہو۔ کہیں ساٹھ کا ہندسہ عبور کرنے کے بعد تم سٹھیا تو نہیں گئے؟"

دین محمد کھوجی کی عمر پینسٹھ سے متجاوز تھی تاہم اس کی نگاہ اور قویٰ ابھی تک درست حالت میں کام کرتے تھے۔ میں نے سٹھیانے والی بات اس کے تجربے کے پیشِ نظر بے ساختہ کہی تھی۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا "مائی باپ! میں سٹھیایا ہوں اور نہ ہی میرا ہنر کوئی غلط رہنمائی کر رہا ہے۔ میری گناہ گار آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں اور ناقص بدھی جو نتیجہ اخذ کر رہی ہے' میں تو اس کے مطابق بول رہا ہوں۔ یقین کرنا یا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔"

اس کی سنجیدگی نے مجھے متاثر کیا۔ میں نے اپنی توجہ اس کی جانب مبذول کرتے ہوئے کہا "اچھا' ٹھیک ہے۔ آگے بتاؤ تمہارا تجربہ اور تجزیہ کیا کہتا ہے؟"

وہ خاموشی کے ساتھ جنگل کے جنوبی حصے میں چند قدم آگے بڑھا اور حتمی لہجے میں بولا "یہ جگہ دیکھ رہے ہیں آپ!" اس نے ننگی زمین کی جانب اشارہ کیا اور مزید کہا "اس مقام سے ان بارہ گھڑ سواروں کی دو ٹولیاں بن گئی ہیں۔ چھ گھڑ سوار ادھر گئے ہیں اور باقی چھ گھڑ سوار ادھر۔" بات ختم کرتے ہی اس نے "ادھر" اور "ادھر" کی نشان دہی بھی کر دی۔ دونوں سمتوں میں لگ بھگ پندرہ ڈگری کا زاویہ حائل تھا۔

میں کھوجی کی ماہرانہ پیش گوئی نما بات پر غور کر ہی رہا تھا کہ ذہن میں روشنی کا ایک تیز جھماکا ہوا۔ مجھے یاد آ گیا کہ گزشتہ رات میں نے چھ افراد پر مشتمل ایک گھڑ سوار پارٹی کو ڈاکوؤں کی تلاش میں تھانے سے روانہ کیا تھا اور انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ جائے وقوعہ سے جنوب کی سمت جنگل میں داخل ہوں۔ ان چھ گھڑ سوار افراد میں چار میرے عملے کے آدمی تھے اور دو براتی رہنمائی کے لیے ان کے ساتھ کر دیے تھے۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ کھوجی بابا نے جو دیگر چھ گھڑ سواروں کا سراغ لگایا ہے' وہ پولیس کی تلاشی پارٹی ہی ہو!

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا "بابا دینا! ادھر ادھر جانے والے گھڑ سواروں میں تمہیں کوئی واضح فرق بھی دکھائی دے رہا ہے؟"

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے جواب دیا "تھانے دار صاحب! گھوڑوں کا کھرا بتاتا ہے کہ ایک پارٹی میں شامل چھ گھوڑوں پر تو صرف ایک ایک آدمی سوار تھا جبکہ دوسری پارٹی میں شامل چھ گھوڑوں پر آٹھ افراد سوار تھے۔ میرے تجربے کے مطابق' چار گھوڑوں پر ایک ایک سوار اور باقی گھوڑوں پر دو دو آدمی سوار تھے۔ گھوڑوں کے سموں کا دباؤ اور اس دباؤ کے نتیجے میں زمین پر بننے والا پھیلا ہوا کھرا اس حقیقت کو کھول کھول کر بیان کر رہا ہے اور گستاخی معاف حضور!" اس نے معافی چاہنے والے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ دیے پھر چٹانی لہجے میں گویا ہوا۔

"یہ تو میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں' میرا علم مجھے دھوکا نہیں دے رہا!"

میں پہلے بھی کھوج کے کئی کیسوں میں دین محمد کی مہارت اور تجربے کو آزما چکا تھا اور میں نے ہمیشہ اسے رزلٹیٹ پایا تھا لیکن اس وقت اپنے علم کے اس بھید نے آٹھ اور چھ گھڑ سواروں کی جو کہانی سنائی تھی اس نے میری سوچ میں ہلچل مچا دی تھی۔ میں ایک سنسنی خیزی کی کیفیت سے دوچار تھا۔ صورتِ حال روزِ روشن کے مانند مجھ پر عیاں ہو چکی تھی۔ بابا دینا کا تجربہ جھوٹا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ ڈاکوؤں نے برات

پر شب خون مارنے کے بعد دلہن اور زیورات و قیمتی تحائف سے بھرے ہوئے جستی صندوق کو بھی اڑا لیا تھا۔ ظاہر ہے دلہن رانی اور مذکورہ صندوق کو بھی گھوڑوں پر ہی لادا گیا تھا لہٰذا کم و بیش دو افراد کا وزن بڑھ گیا اور یقیناً دو گھوڑوں پر اس وزن کو تقسیم کر کے لادا گیا ہو گا۔ ایک گھڑ سوار ڈاکو نے دلہن کو سنبھالا ہو گا اور دوسرے نے قیمتی ملبوسات اور زیورات سے بھرے ہوئے صندوق کو۔ اس حساب سے اگر دیکھا جاتا تو کھوجی دین محمد سو فی صد درست نتائج اخذ کر رہا تھا۔

میں نے اضطراری لہجے میں کہا "بابا دینا! ہم اس کھرے کا تعاقب کریں گے جس میں چھ گھوڑوں پر آٹھ افراد سوار تھے!"

دین محمد نے کوئی سوال نہ کیا اور اپنے کام میں جت گیا تاہم تھوڑی دیر بعد میں نے خود ہی اپنے اس فیصلے کی وضاحت کر دی۔

"مجھے اندازہ ہو گیا تھا!" کھوجی نے پُراعتماد لہجے میں تبصرہ کیا۔

ہم لگ بھگ آدھے گھنٹے تک گھنے جنگل میں جنوب کی سمت آگے بڑھتے رہے۔ اس دوران میں کبھی ہم گھوڑوں پر سوار ہو جاتے اور کبھی گھوڑوں کی لگام تھام کر ساتھ ساتھ پیدل چلنے لگتے۔ کھوجی دین محمد ہم سے چند قدم آگے ہمارا رہنما بنا چل رہا تھا۔ میں اور کانسٹیبل قدیر اس کی ہدایت اور مشورے کے مطابق رکتے اور آگے بڑھتے تھے۔ ہم اس وقت جس فن اور ہنر کی روشنی میں سفر کر رہے تھے اس کا ماہر اور عالم بہرحال دین محمد کھوجی ہی تھا لہٰذا اس کی پیروی ہم پر لازم تھی!

کم و بیش نصف میل جنگل کے اندر آنے کے بعد دین محمد رک گیا۔ مجبوراً ہمیں بھی رکنا پڑا۔ کھوجی نے دس گز کے دائرے میں بہ غور جنگلی زمین کا جائزہ لیا اور حتمی لہجے میں یہ فتویٰ صادر کر دیا۔

"اس مقام پر گھڑ سواروں نے قیام کیا ہے۔ میں یہاں گھوڑوں کے کھرے کے علاوہ سات بندوں کا کھرا بھی دیکھ رہا ہوں اور......" وہ ایک لمحے کو ڈرامائی انداز میں خاموش ہوا پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"اور...... ان سات بندوں کے کھرے میں ایک عورت کا کھرا بھی شامل ہے۔ یعنی یہاں پر چھ مردوں اور ایک عورت کے قدموں کا کھرا موجود ہے۔"

اب اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ چھ ڈاکوؤں اور مغوی رانی نے اس مقام پر عارضی پڑاؤ ڈالا تھا۔ عارضی اس لیے کہ اب وہ وہاں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے سنسنی خیز لہجے میں دین محمد سے استفسار کیا۔

"تم جن چھ مردوں اور ایک عورت کے کھرے کی بات کر رہے ہو' وہ ساتوں اب یہاں موجود نہیں ہیں۔ ذرا یہ بھی تو پتا چلاؤ کہ وہ آگے کس طرف گئے ہیں؟"

"ابھی لیں جناب!" کھوجی یہ کہتے ہوئے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

دس منٹ بعد اس نے واپس آ کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "جناب! میں یہ تو نہیں بتا سکتا' ان لوگوں نے یہاں کتنا قیام کیا ہے مگر ایک بات کا مجھے وثوق ہے' وہ یہاں سے واپس راہ گزر کی طرف گئے ہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو دین محمد!" اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا۔

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں سرکار۔" وہ اٹل لہجے میں بولا۔

"لیکن...... وہ واپس کیسے جا سکتے ہیں؟" اس کی بات ہضم ہونے والی نہیں تھی۔

وہ اپنی دھن میں بولتا چلا گیا "تھانے دار صاحب! تھوڑے فاصلے پر میں نے پھر چھ گھوڑوں کے سموں کا کھرا ڈھونڈ لیا ہے۔ لگتا ہے' ساتویں عورت کو انہوں نے دوبارہ کسی گھوڑے پر سوار کر لیا تھا۔ ان چھ گھوڑوں کے کھروں میں دو کھرے وہی بات ظاہر کر رہے ہیں یعنی ایک ایک گھوڑے پر دو دو سوار۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا "یا یوں کہہ لیں' ان دو گھوڑوں میں سے ایک پر ڈاکو کے ساتھ دلہن سوار اور دوسرے پر ڈاکو کے ساتھ زیورات والا صندوق لدا ہوا۔"

کھوجی کے ماہرانہ تجزیے سے ظاہر ہوتا تھا' ڈاکوؤں نے رانی سمیت کچھ وقت اس مقام پر گزارا تھا پھر واپسی کی راہ لی تھی۔ واپسی والی صورت اگرچہ ناقابلِ ہضم تھی تاہم میں نے ایک دوسرے زاویے سے کھوجی سے پوچھا۔

"دین محمد! اس مقام پر تم نے جن چھ مردوں اور ایک عورت کا کھرا نکالا ہے اس سے کسی افراتفری کا بھی اندازہ ہوتا ہے یا یہاں قیام کے دوران میں' ان میں صلح صفائی ہی نظر آ رہی ہے؟"

وہ چھ ڈاکو ایک دلہن کو بھری برات میں سے اٹھا لائے تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ رانی' اس زیادتی کے خلاف مزاحمت نہ کرتی۔ اس نے خود کو چھڑانے اور ڈاکوؤں کے چنگل سے نکلنے کے لیے تھوڑی بہت جدوجہد تو کی ہو گی...... اور یہ مدافعتی تگ و دو اس کے قدموں کے نشانات کی صورت میں

وہاں ضرور ثبت ہونا چاہیے تھی لیکن کھوجی کے جواب نے میرے تمام اندازوں کی نفی کر دی۔

"جناب امیر اختر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس جگہ پر قیام کرنے والے سات افراد میں کسی قسم کی چھینا جھپٹی یا کھینچا تانی نہیں ہوئی۔ وہ لوگ امن و امان سے یہاں رکے اور پھر آگے بڑھ گئے یعنی واپسی کی راہ پر گامزن ہو گئے۔"

پہلی بات کی طرح کھوجی کی یہ دوسری بات بھی میرے لیے ناقابلِ یقین تھی۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا "کیا تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو دلہن راضی خوشی ڈاکوؤں کے ہاتھوں اغوا ہوئی ہے؟"

"جناب! میں تو اپنے تجربے کی روشنی میں کھرے کے نتائج آپ کو بتا رہا ہوں۔" وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا "میں اپنے طور پر تو کچھ بھی ثابت کرنے یا توڑنے کی کوشش نہیں کر رہا۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اس سے کہا "ٹھیک ہے دین محمد! اب ہم اس کھرے کا تعاقب کریں گے جو یہاں سے واپسی کی راہ دکھا رہا ہے۔ تم آگے آگے چلو گے۔"

وہ تھوڑی دیر تک سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر گردن جھکا کر بولا "جو حکم سرکار! آ جائیں میرے پیچھے پیچھے۔"

دس پندرہ قدم ایک نیم بیضوی دائرے میں چلنے کے بعد ہم دوبارہ جنگل سے شمال کے رخ رہ گزر کی سمت بڑھنے لگے تاہم اس مرتبہ زاویے میں تھوڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ یہ وہ راستہ نہیں تھا جس پر چل کر ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ ہم واپس رہ گزر کی جانب تو جا رہے تھے مگر بانداز دگر!

تھوڑی ہی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا' ہم قدرے مختلف راستے سے رہ گزر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اس صورت میں بھی ہم مذکورہ رہ گزر تک پہنچ جاتے لیکن یہ وہ مقام نہ ہوتا جہاں گزشتہ رات تیرے جرم کی ایک لرزہ خیز واردات ہوئی تھی۔

اس وقت میرے ذہن میں تیز آندھیاں شور مچا رہی تھیں اور ان آندھیوں کا سبب وہ سوال تھا جو تھوڑی دیر پہلے میں نے بے ساختہ کھوجی دین محمد سے پوچھا تھا۔ "....کیا تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو دلہن راضی خوشی ڈاکوؤں کے ہاتھوں اغوا ہوئی ہے!"

میں نے کسی ذہنی الجھن کے باعث بے اختیار یہ سوال کر دیا تھا لیکن اب سوچ رہا تھا' ایسا ہونا ناممکنات میں سے تو نہیں۔ پھر رہ رہ کر اس واقعے کے مختلف پہلو میری سوچ میں ابھار ہونے لگے۔ ڈاکوؤں کی نپی تلی کارروائی' دلہا کا قتل' قیمتی سامان سمیت دلہن کا اغوا اور ڈاکوؤں کا محض ان افراد کو شدید زخمی کر کے ناکارہ بنانا جو مسلح تھے اور ان کے راستے کی رکاوٹ بن سکتے تھے۔ کیا ایسا تھا کہ ڈاکوؤں نے دلہن کے ایما پر اسے اغوا کیا ہو؟

یہ بہت ہی خطرناک سوال تھا لیکن حالات و واقعات کی روشنی میں قرین قیاس لگتا تھا۔ اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو پھر یہ بات بھی یقینی تھی کہ دلہن عارف کی منکوحہ بن کر زندگی نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ وہ کسی اور کو چاہتی تھی اور اسی شخص نے خود یا ڈاکوؤں کے توسط سے اغوا کر لیا تھا اور اس دھواں دھار انداز میں اغوا کیا تھا کہ اس علاقے کی ایک خونریز تاریخ مرتب ہو گئی تھی!

بہرحال' یہ سب امکانی باتیں تھیں اور یکسر غلط بھی ہو سکتی تھیں۔ ذہن کا کام ہے مسلسل سوچنا اور کسی خاص انداز میں سوچنے کے لیے اسے بس ایک معمولی سا اشارہ چاہیے ہوتا ہے۔ میں بھی اسی حوالے سے ایک مخصوص ڈگر پر گھوڑے خیال کو دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ حقیقت کیا تھی' یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا اور بے شک وقت بہت بڑا معلم ہے!

کچھ دیر بعد اس راستے پر پہنچ گئے جو چک بتیس کو چک چوراسی سے ملاتا تھا اور اسی راستے پر گزشتہ رات ایک ناقابلِ فراموش واردات ہوئی تھی تاہم حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ہم جس مقام پر نکلے تھے وہ جائے وقوعہ سے لگ بھگ نصف میل کے فاصلے پر مغرب میں چک بتیس کی سمت واقع تھا۔ پتا نہیں وہ عجیب و غریب ڈاکو چند گھنٹوں کی دلہن کو کہاں لے جانا چاہتے تھے!

میں نے سوالیہ نظر سے کھوجی محمد کو دیکھا اور کہا "اب کہاں کا رخ کرنا ہے بابا دینا؟"

"جدھر کھرا لے جائے جناب!" وہ بدستور سنجیدہ لہجے میں بولا۔

ایک مرتبہ پھر ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ اب ہم اس راستے سے شمال میں واقع گھنے جنگل میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ڈاکو بہت ہی شاطر اور چالاک ثابت ہو رہے تھے۔ پہلے انہوں نے واردات کے فوراً بعد جنگل کے جنوبی حصے کی راہ اختیار کی چنانچہ لامحالہ میرا ذہن سلطان پورہ کی طرف چلا گیا۔ اب ان کا کھرا شمال جنگل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ پتا نہیں حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ جب تک اس کھرے کے سہارے میں کسی واضح منزل تک نہ پہنچ جاتا' حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا اور مجھے یقین تھا' بہت جلد میری یہ تگ و دو منزل کو ابھار کر سامنے لے آئے گی۔

انسان کا یقین اس کائنات کا طاقتور ترین جذبہ ہے۔

اس کے بل بوتے پر ناممکن کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ خالق اور مخلوق کا تعلق بھی اسی جذبے پر استوار ہے ورنہ وہ ذات پاک انسان کے عملی تجربے میں آنے والی نہیں!

جلد ہی میرا یقین رنگ لے آیا اور ہم ڈاکوؤں کا کھرا پکڑتے ہوئے ایک متروک کنوئیں تک جا پہنچے۔ یہ مقام جنگل کے اختتام پر واقع تھا۔ کھوجی نے متروک کنوئیں کے پاس رکتے ہوئے کہا۔

"یہاں پر بھی ان لوگوں نے رک کر کچھ وقت گزارا ہے۔"

ہم گھوڑوں سے اتر آئے اور اس مقام کا جائزہ لینے لگے۔ کھوجی ایک مرتبہ پھر کھوج کے کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ وہاں کی زمین کو اپنے تجربے کی کسوٹی پر پرکھ رہا تھا۔ میں اور کانسٹیبل گھوم پھر کر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ کیا؟ یہ ذہن میں واضح نہیں تھا۔ بس ہم کچھ نہ کچھ ڈھونڈ نکالنے کی تگ و دو میں تھے۔

وہ جنگل کا اختتام تھا۔ اگر وہاں سے سیدھا شمال میں مزید سفر جاری رکھا جاتا تو لگ بھگ پانچ میل بعد موضع شاکوٹ واقع تھا۔ شاکوٹ سے ایک راستہ چک بتیس کی طرف بھی آتا تھا۔ یہ تمام گاؤں دیہات میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے اور میرے دیکھے بھالے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں بہت کم تھانے ہوا کرتے تھے۔ بعض تھانوں کی حدود تو بیس تیس میل سے بھی تجاوز کر جاتی تھی۔ آج کل کی طرح آسانیاں حاصل نہیں تھیں تاہم ایک بات میں افسوس کے ساتھ ضرور کہوں گا اور وہ یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہم نے بہت ترقی کی ہے مگر اکثر شعبوں میں یہ ترقی معکوس کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے زمانے میں جرائم کی بیخ کنی کا تناسب آج سے بہت زیادہ تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد میری تلاش نتیجہ خیز ثابت ...... ہوئی۔ میں ایک جستی صندوق تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس صندوق کا سائز لگ بھگ ڈیڑھ ضرب ڈھائی فٹ رہا ہو گا۔ صندوق گھنے درختوں کے درمیان کھلا اور الٹا پڑا تھا۔ ایک نظر دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا' صندوق کا تالا توڑ کر اسے کھولا گیا تھا۔

میں نے اس صندوق کو "سیدھا" کیا تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ وہ خالی تھا۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ یہ وہی جستی صندوق تھا جسے برات سے دلہن کے ساتھ ہی اڑا لیا گیا تھا۔ اب وہاں دلہن کہیں نظر آ رہی تھی اور نہ ہی صندوق کا قیمتی سامان کہیں دکھائی دے رہا تھا۔

بادی النظر میں یہی محسوس ہوتا تھا ڈاکوؤں نے صندوق کا سامان سمیٹ کر ایک پوٹلی بنائی ہو گی اور وزنی صندوق سے نجات حاصل کر کے آگے بڑھ گئے ہوں گے۔

آگے کہاں؟ کس طرف؟ ان سوالات کے جوابات کھوجی ہی دے سکتا تھا!

تھوڑی دیر بعد دین محمد ہمارے قریب آ گیا۔ میں نے اسے جستی صندوق کے بارے میں بتایا۔ اس نے میرے اندازے پر صاد کیا اور بولا۔

"مجھے بھی یہی لگتا ہے جناب! وہ لوگ صندوق کا سامان سمیٹ کر آگے بڑھ گئے ہیں۔"

میں نے جلدی سے پوچھا "آگے کہاں دین محمد؟"

وہ اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے بولا "یہاں سے وہ دو مختلف سمتوں میں روانہ ہوئے ہیں۔ ایک گھوڑے کا کھرا شمال کی نشاندہی کر رہا ہے۔ اس گھوڑے پر سوار افراد کی تعداد دو ہے۔ باقی پانچ گھوڑوں کے سموں کا کھرا واپس جنگل کی طرف جاتا دکھائی دیتا ہے۔"

یہ ایک الجھی ہوئی صورت حال تھی۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ مجھے خاموش دیکھ کر دین محمد نے پوچھا "اب کس طرف چلنے کا حکم ہے سرکار؟"

میں نے ایک لمحہ غور کیا۔ شمال کی سمت دور دور تک کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ کھیتوں کے درمیان سے ایک تنگ سا کچا راستہ شاکوٹ جاتا تھا جو وہاں سے کم و بیش پانچ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ہمارے عقب میں وہی گھنا جنگل تھا جس سے گزر کر ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے کھوجی سے کہا۔

"پہلے جنگل کو چیک کر لیتے ہیں۔ پھر شمالی رخ کو بھی دیکھ لیں گے۔"

"جو حکم آپ کا۔" وہ فرمانبرداری سے بولا۔

کھوجی نے اپنا کام شروع کر دیا۔ میں اور کانسٹیبل قدرے اس کی پیروی میں آگے بڑھنے لگے۔ ہم جس سمت سے چلتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے' واپس جاتے ہوئے اس سمت میں اچھا خاصا فرق آ گیا تھا۔ اس تبدیل شدہ زاویے پر سفر کرتے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے تھے کہ موسم کے تیور بدلنے لگے۔

کھوجی نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اللہ خیر کرے۔ اس وقت بارش نہیں ہونا چاہیے ورنہ ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔"

ہم اس وقت گھنے جنگل میں سے گزر رہے تھے جہاں کہیں سے آسمان نظر آ رہا تھا وہاں سے آسمان کے ارادے

بڑے خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔ گلابی جاڑے کا آغاز تھا۔ موسم سرما کے آغاز سے پہلے ایک آدھ بارش ہو جایا کرتی تھی جس سے درجۂ حرارت میں بڑی حد تک کمی واقع ہو جاتی تھی۔ یہ ایک طرح سے موسم سرما کا ٹریلر ہوا کرتا تھا۔

میں بھی اس وقت دل سے بارش کی مخالفت میں تھا۔ ہم ڈاکوؤں کا کھرا پکڑ کر کسی نتیجے پر پہنچنے والے تھے۔ اس موقع پر واقعی بارش رنگ میں بھنگ ڈال دیتی۔ ہم ستور راہ کو دیکھتے اور ایک مرتبہ پھر وہیں کھڑے ہوتے جہاں سے چلے تھے۔

میں نے مضبوط لہجے میں کہا ''دین محمد! دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔ تم اپنے کام کی رفتار کو بڑھا دو۔''

''وہ تو میں آپ کے حکم سے پہلے ہی بڑھا چکا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

ہم تیز رفتاری سے اپنا کام کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے اور مزید ایک گھنٹے کی ''عرق ریزی'' کے بعد ہم اس راستے پر نکل آئے جس پر وہ سنگین واردات وقوع پذیر ہوئی تھی لیکن اس مرتبہ ہم ایک نئے مقام پر کھڑے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق یہ مقام جائے وقوعہ سے کافی فاصلے پر مغربی حصہ تھا۔

میں نے نگاہ اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ میں نے نیلے جاودانی آسمان کو اس وقت گہرے سرمئی بادلوں سے ڈھکا ہوا پایا حالانکہ جب صبح ہم تھانے سے روانہ ہوئے تھے تو مطلع صاف و شفاف تھا۔ ہماری جنگل نوردی کے دوران ہی میں آسمان کا مزاج بدلا تھا۔ شاید ایسے ہی موقع کے لیے کہا جاتا ہے ''بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے!''

میں نے کھوجی کو زمین کے ساتھ مصروف پایا تو اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''موسم کے تیور تم بھی دیکھ چکے ہو دین محمد! جو بھی کرنا ہے جلدی جلدی کر لو ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ ابھی ہمیں واپسی متروک کنوئیں کی طرف بھی جانا ہے۔''

''جناب! میں نے پانچ گھوڑوں کے سموں کا کھرا نکال لیا ہے۔'' وہ پُروثوق انداز میں بولا ''وہ لوگ اسی راستے پر چلتے ہوئے مغرب کی طرف گئے ہیں۔ آپ کا حکم ہو تو میں آگے بڑھوں؟''

دین محمد کے انکشاف نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ مغرب کی جانب چک بتیس واقع تھا۔ مقتولہ دلہن رانیہ عرف رانی کا تعلق اسی چک سے تھا۔ میرے چونکنے کا سبب رانی نہیں بلکہ بشارت اینڈ کمپنی تھا۔ رانی کا ماموں الیاس اور اس کا بیٹا بشارت اسی گاؤں میں رہتے تھے۔ اور یہ لوگ مشکوک افراد کی فہرست میں ٹاپ پر تھے۔ میں برق رفتاری سے ان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

مقتول عارف کے باپ خدا بخش کا کہا ہوا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں تازہ تھا۔ اس کے بیان کے مطابق رانی کی ماں خدیجہ اپنی بیٹی کی شادی بھائی الیاس کے بیٹے سے کرنا چاہتی تھی۔ الیاس کا بیٹا بشارت بھی رانی کو چاہتا تھا لیکن رانی کا باپ اللہ بخش اپنے سالے اور اس کے بیٹے کو سخت ناپسند کرتا ہے لہٰذا اس نے بیوی کی ہزار مخالفت کے باوجود بھی بیٹی کی شادی چھوٹے بھائی کے بیٹے عارف سے کر دی تھی جس کے نتیجے میں بشارت اور الیاس وغیرہ نے اس شادی کا مکمل بائیکاٹ کر دیا تھا۔

ڈاکوؤں کے قدموں کے آثار چک بتیس کی جانب بڑھنے لگے تو میرا ذہن لامحالہ منفی زاویے پر الیاس اور اس کے بیٹے بشارت کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے دین محمد سے کہا۔

''نیک کاموں میں تاخیر مناسب نہیں ہوتی دین محمد۔ بسم اللہ کرو۔''

میری بات ختم ہوئی تھی کہ آسمان کے آنسو نکل آئے۔ پتا نہیں، یہ خوشی کے آنسو تھے یا ماتم کے! دیکھتے ہی دیکھتے ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اسی لمحے میرے ذہن میں یہ حقیقت تازہ ہو گئی...... تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ!

''لو جی! ہو گیا کام!'' کھوجی نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے مایوسی سے کہا۔

میں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور قدرے مضبوط لہجے میں کہا ''دین محمد! دل ہارنے کی ضرورت نہیں۔ تم آگے بڑھتے رہو۔ مجھے لگتا ہے، جلد ہی یہ بوندا باندی رک جائے گی۔''

آسمان شاید میری آواز پر کان لگائے بیٹھا تھا۔ ادھر میں نے بات پوری کی، ادھر بارش کی رفتار میں اضافہ ہو گیا۔ اب باقاعدہ مینہ برس رہا تھا، اسے بوندا باندی کہنا سخت حماقت ہوتی۔ دین محمد نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

''ملک صاحب! ڈاکوؤں کا کھرا تو سمجھیں، گیا ہاتھ سے۔ اب ہمیں خود کو بھیگنے سے بچانا ہوگا۔ اگر یہ پالا (ٹھنڈ) میری بوڑھی ہڈیوں میں اتر گیا تو بڑی آفت بچ جائے گی۔''

دین محمد اگرچہ پینسٹھ کے قریب تھا لیکن اس کا شمار ''ساٹھا پاٹھا'' مردوں میں ہوتا تھا۔ اس کی صحت کو قابل رشک کہا جا سکتا تھا۔ یہ معمولی سی سردی اس کی ہڈیوں تک رسائی حاصل نہیں

کر سکتی تھی۔ بہرحال اس نے بھیگنے سے بچنے والی بات بڑی معقول اور بروقت کی تھی۔

ایک آزمودہ حقیقت ہے کہ کسی بھی موسم کی ابتدائی شدت اور سختی انسانی صحت کے لیے زیادہ تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ اس میں بیماریاں منہ کھولے اور پر پھیلائے چاروں جانب منڈلا رہی ہوتی ہیں۔ اس کی نسبت جاتے ہوئے موسم کی شدت اور سختی ہمیشہ فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔

اس بات کے آثار نہیں تھے کہ بارش ہو جائے گی لہٰذا ہم نے تھانے سے روانہ ہوتے وقت بارش سے بچاؤ کا کوئی بندوبست بھی نہیں کیا تھا۔ ہمارے جسموں پر مناسب گرم لباس موجود تھا لیکن اگر یہ لباس بارش میں شرابور ہو جاتا تو اس کی ساری گرمی ایک طرف رہ جاتی۔ الٹا یہ ہمارے لیے جی کا جنجال بن کر رہ جاتا۔ اس اچانک شروع ہو جانے والی بارش نے موسم سرما کو باقاعدہ آغاز دے دیا تھا۔ میں نے دین محمد کھوجی کی بات کے جواب میں کہا۔

''دین محمد! تم عمر کے لحاظ سے لاکھ بوڑھے سہی لیکن تمہاری ہڈیاں ہم جوانوں سے زیادہ برداشت کی مالک ہیں۔ یہ ہلکی پھلکی بارش تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی بہرحال، اس سے بچنا بھی ضروری ہے۔'' میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس وقت بارش کے خلاف سب سے محفوظ پناہ گاہ یہ گھنا جنگل ہی ہے۔ آؤ اس طرف چلتے ہیں۔''

پھر ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر آگے پیچھے جنگل میں داخل ہو گئے۔ جلد ہی ہم ایک ایسے مقام تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جہاں تین درختوں کے بالائی حصے آپس میں خلط ملط ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کی چوٹیاں باہم پیوست ہو کر ایک بلند و بالا چھتری کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ پتے دار گھنی شاخوں میں سے چھن کر بارش کا پانی نیچے تک نہیں پہنچ پا رہا تھا گویا ہم وہاں پناہ لے کر بارش سے واقعی محفوظ ہو گئے تھے۔

دین محمد کھوجی نے چہرہ اٹھا کر اوپر دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''بس جی خدا کی قدرت ہے!''

اس کے اس مبہم سے جملے نے مجھے اکسایا اور میں نے پوچھ لیا ''دین محمد! تمہیں اس ہنگامی پناہ گاہ میں خدا کی کون سی قدرت نظر آگئی۔ ذرا مجھے بھی تو بتاؤ؟''

''جناب! خدا ہر جگہ موجود ہے اس لیے اس کی قدرت بھی ہر جگہ پائی جاتی ہے۔'' وہ کسی فلسفی کے سے انداز میں بولا ''ویسے میں اس وقت نیلی اور ہری چھتری کی بات کر رہا تھا۔''

''نیلی اور ہری چھتری؟'' میں نے چونک کر سوال کیا۔

وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''ادھر باہر روگزر پر نیلی چھتری ہمیں بھگونے پر تلی ہوئی تھی اور یہاں ہری چھتری نے ہمیں بھیگنے سے محفوظ کر رکھا ہے۔ اندر بھی خدا کی قدرت، باہر بھی اس کی قدرت!''

میں پلک جھپکنے میں سمجھ گیا، نیلی اور ہری چھتری سے اس کی مراد بالترتیب آسمان اور درختوں کا جھنڈ تھی۔ بعض اوقات ایک سیدھا سادہ ان پڑھ شخص بھی اتنی گہری بات کر جاتا ہے کہ ہزاروں لاکھوں کتابیں اپنے ذہنوں میں اتارے ہوئے بھی اش اش کر اٹھتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کسی ان پڑھ کو بھی جاہل نہیں سمجھنا چاہیے۔ سمجھداری اور بردباری کا تعلق علم سے نہیں بلکہ عمل اور تجربے سے، مشاہدے اور غور و فکر سے ہے...... اور یہ تمام تر کام کسی کتاب کو ہاتھ لگائے بغیر بھی کیے جا سکتے ہیں!

ہم نے گھنے درختوں کے اس جھنڈ میں بمشکل بیس پچیس منٹ گزارے ہوں گے کہ بارش تھم گئی۔ میں نے دین محمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''چلو باہر نکل کر راستے کا جائزہ لیتے ہیں۔''

''ہاں جناب! اب تو راستے کا جائزہ ہی لیا جا سکتا ہے۔ یہ بے چارہ کہیں نہیں جاتا حالانکہ ازل سے انسان کہتا چلا آرہا ہے...... اور ابد تک کہتا رہے گا کہ فلاں راستہ فلاں جگہ جاتا ہے۔ ان اللہ کے بندوں سے کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ ایسی باتیں کیوں کرتے ہو۔ بھئی! راستہ تو اپنی جگہ رہتا ہے لیکن اس پر سفر کرنے والے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں جیسے اپنے یہ ڈاکو...... اور ان کے گھوڑوں کے سموں کے نشان۔''

دین محمد کی تجربہ کاری نے ڈھکے چھپے انداز میں مجھے باور کرا دیا کہ ہم ڈاکوؤں کے کھرے سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ جب ہم گھنے جنگل میں سے برآمد ہو کر کچے راستے پر پہنچے تو اس کی بات سچ ثابت ہو گئی۔ درختوں کی آڑ میں رہتے ہوئے ہمیں اندازہ نہیں ہوا تھا، باہر بارش نے کیا کیا کارنامے سرانجام دے ڈالے تھے! اب جو دیکھا تو پتا چلا، دوسرے برساتی مسائل تو رہے ایک طرف، ڈاکوؤں کا کھرا ناپید ہو چکا تھا۔ ہماری اب تک کی ساری محنت اکارت ہو گئی تھی۔

میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ''یہ بہت برا ہوا!''

''خدا کو یہی منظور تھا جناب!'' دین محمد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

upload by salimsalkhan @yahoo.com

اس کے اظہار کا انداز ایسا تھا جیسے کسی کی موت پر گہرے غم کے ساتھ ساتھ وہ ایک ازلی حقیقت کو بھی بیان کر رہا ہو۔

میں نے پوچھا ''تمہارا کیا خیال ہے ادھر متروک کنوئیں کی جانب جانے کا کوئی فائدہ ہوگا؟''

''مجھے یقین ہے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' وہ اٹل لہجے میں بولا ''اس طرف کنوئیں سے آگے کھیتوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ اس بارش کے بعد ادھر کسی کا کھرا نکالنا ممکن نہیں رہا لیکن اگر آپ کا حکم ہو تو میں چلنے کو تیار ہوں۔''

دین محمد ایک وزنی اور معقول بات کر رہا تھا۔ متروک کنوئیں سے آگے کا علاقہ میں نے بھی دیکھا تھا۔ لہلہاتے سرسبز کھیتوں کے بیچ میں سے ایک تنگ سا کچا راستہ شاہکوٹ کی طرف جاتا تھا۔ وہ راستہ اس رہ گزر سے کہیں زیادہ مخدوش تھا جس پر گزشتہ رات ڈاکوؤں نے وحشیانہ پن کا مظاہرہ کیا تھا۔ جب راہ گزر پر ڈاکوؤں کا کھرا ناپید ہو چکا تھا تو پھر کھیتوں کے بیچ سے کھرا اٹھانا یا اٹھانے کی کوشش کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔

لمحاتی سوچ بچار کے بعد میں اس فیصلے پر پہنچا کہ ہمیں واپسی کا رخ کرنا چاہیے۔ میرے حکم پر قدیر اور دین محمد نے اپنے گھوڑے موڑ لیے اور ہم تھانے کی جانب روانہ ہو گئے۔

لگ بھگ پانچ گھنٹے کی اس بھاگ دوڑ میں انتہائی کام کی دو باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ اول ایک گھوڑے پر سوار دو افراد جنگل کے اختتام پر شمال کی سمت بڑھے تھے۔ وہ شاہکوٹ گئے تھے یا نہیں اور اس بارے میں سردست کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ دوم پانچ گھوڑوں پر سوار باقی ڈاکوؤں نے چک بتیس کا رخ کیا تھا۔ یہ بھی حتمی نہیں تھا کہ وہ چک بتیس پہنچے تھے یا کسی اور سمت نکل گئے تھے۔ اگر ہم ان کا کھرا نہیں کھو دیتے تو ہماری منزل آسان ہو جاتی۔

ڈاکوؤں کا کھرا بارش کے سبب غائب ہوا تھا جو ایک قدرتی عمل ہے۔ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے انسان اس کو سمجھے یا نہ سمجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا!

☆☆☆

تھانے میں ایک ہجوم لگا ہوا تھا۔

ان میں زیادہ تعداد چک بتیس والوں کی تھی۔ دلہن کا باپ اللہ بخش اس کی بیوی خدیجہ اور دیگر کئی رشتے دار وہاں پہنچے تھے۔ ظاہر علی نے جیسے ہی یہ اندوہناک خبر وہاں پہنچائی وہ لوگ روتے دھوتے اور گرتے پڑتے میرے پاس آ گئے تھے۔ ان میں چک چوراسی کے چند افراد بھی شامل تھے۔ اللہ بخش کا چھوٹا بھائی خدا بخش بھی ایک طرف سر جھکائے آزردہ بیٹھا تھا۔ ان سب کی آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا...... ڈاکوؤں کا سراغ ملا کہ نہیں؟

میں سب کو ایک ساتھ اپنے کمرے میں بلا کر مچھلی بازار گرم نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا دو انتہائی متعلقہ افراد کو اندر بلا لیا یعنی دلہن اور دولہا کے باپ اللہ بخش اور خدا بخش کو۔

''تھانے دار صاحب! آپ کے علاقے میں یہ کیا قیامت گزر گئی؟'' اللہ بخش دل گرفتہ لہجے میں بولا۔

میں اس کی دلی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا۔ پہلے تو میں نے نہایت ہی مختصر اور مؤثر الفاظ میں اس واقعے پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اسے اپنے تعاون کا بھرپور یقین لایا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اس قیامت کو برپا کرنے کے ذمے دار افراد کو میں جس قیامت سے گزاروں گا اسے بھی دنیا دیکھے گی۔ آپ لوگ حوصلہ رکھو۔ میں گزرے ہوئے وقت کو تو پیچھے نہیں لا سکتا البتہ ڈاکوؤں کی گرفتاری اور دلہن کی بازیافت کے لیے میں حتی المقدور کوشش کر رہا ہوں۔''

خدا بخش نے پوچھا ''آپ آج صبح سے جائے وقوعہ کی طرف گئے ہوئے تھے۔ کوئی کامیابی حاصل ہوئی؟''

''ہاں جزوی کامیابی ہاتھ آئی ہے۔'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا پھر انہیں اس بھاگ دوڑ کے نتائج سے آگاہ کر دیا۔

اللہ بخش نے کہا ''یہ تو بہت ہی الجھی ہوئی صورت حال ہے۔ دو ڈاکو متروک کنوئیں سے کھیتوں کی جانب بڑھ گئے۔ باقی ڈاکوؤں نے چک بتیس کا رخ کیا۔ یہ کیسے پتا چلے گا وہ لوگ میری رانی کو کہاں لے گئے ہیں؟''

''یہ پتا تو تمہارے تعاون سے چل سکتا ہے اللہ بخش!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ جلدی سے بولا ''میں تو ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔ آپ حکم کریں!''

میں چند لمحات تک گہری نظر سے باری باری ان دونوں بھائیوں کو دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''دیکھو بھائی! یہ تو ظاہر ہے ڈاکوؤں کی کارروائی کسی بھیانک انتقام کا نتیجہ ہے۔ یہ تم دونوں میں سے کسی کے دشمن کا بھی کارنامہ ہو سکتا ہے۔ یہ دشمنی عارف یا رافعہ سے بھی ممکن ہے۔ ڈاکوؤں نے بھری پری برات پر شب خون مار کر دولہا کو قتل کیا اور دلہن کو زیورات کے صندوق سمیت اٹھا کر لے گئے۔ صندوق کا قصہ میں تم لوگوں کو سنا چکا ہوں۔ تم دونوں نے صندوق کو شناخت بھی کر لیا ہے۔'' میں نے تھوڑا توقف کر کے ان کے

تاثرات کا جائزہ لیا۔

...واپسی پر تالا ٹوٹا ہوا وہ خالی صندوق ہم اپنے ...جنگل سے ...لائے تھے۔ اللہ بخش اور خدا بخش کو وہ صندوق دکھا کر ...نے تصدیق کر لی کہ یہ وہی صندوق تھا جس میں دلہن کے ...طلائی زیورات، عروسی ملبوسات اور دیگر قیمتی تحائف رکھے ہوئے ...تھے۔

...میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جہاں تک میں ڈاکوؤں کا کھرا اٹھوانے میں کامیاب ...ہوا ہوں اس کے مطابق دلہن رانی کو یا تو شاہکوٹ کی طرف لے ...جایا گیا ہے اور یا پھر اسے چک بتیس پہنچایا گیا ہے۔ اب تم مجھے ...بتاؤ ان دو مقامات پر تم لوگوں کا کون دشمن ہو سکتا ہے؟''

...اللہ بخش نے کہا ''شاہکوٹ میں تو میری چھوٹی سالی سلمٰی ...رہتی ہے۔ وہ بے چاری بیوہ ہے اور اپنے منجھلے بیٹے کے ساتھ ...گزارا کر رہی ہے۔ سلمٰی کا ہمارے گھر میں آنا جانا ہے۔ ...ہمارے درمیان بہت خوشگوار تعلقات ہیں۔ اس کی طرف سے ...کسی قسم کی دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سلمٰی تو بڑی دھوم ...دھام سے شادی کی تمام تقریبات اور رسموں میں شامل رہی ...ہے۔ وہ آٹھ دس دن سے اپنے بیٹے کے ساتھ ہمارے گھر میں ...ٹھہری ہوئی ہے اور برات کے ساتھ وہ بھی چک چوراسی گئی ...تھی۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر دل گیر لہجے میں

''رانی سلمٰی کے ساتھ بہت ہلی ہوئی ہے۔ اسی لیے ...رخصتی کے بعد وہ اسے سسرال پہنچانے ساتھ چلی آئی تھی۔ میں ...سلمٰی سے نہیں مل سکا۔ پتا نہیں اس بے چاری کا ...کیا حال ہوگا۔ چک چوراسی پہنچتے ہی ہم سیدھے تھانے چلے ...آئے تھے۔''

''میں کل رات تمہاری سالی سلمٰی سے مل چکا ...ہوں۔'' میں نے اللہ بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''وہ رانی کو ...پیش آنے والے واقعے کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ میں نے ...اسے کافی تسلی دی ہے۔ وہ خاصی سمجھ دار عورت ہے۔ اس نے ...مجھے ایک راہ بھی سجھائی تھی۔ میں نے اس کی دکھائی ہوئی راہ پر ...قدم بڑھائے ہیں لیکن تازہ ترین حالات سے لگتا ہے سلمٰی کی ...فراہم کردہ معلومات سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔''

خدا بخش نے چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا ''سلمٰی سے ...آپ کی ملاقات میرے گھر میں ہوئی تھی۔ آپ نے مجھ سے تو ...ذکر نہیں کیا اس نے آپ کو کیا راہ سجھائی تھی؟''

''میں نے تم سے ذکر کیا تھا خدا بخش!'' میں نے ٹھوس ...لہجے میں کہا ''شاید پریشانی میں تمہارے ذہن سے نکل گیا ہے۔ ...ویسے اس میں تمہارا کچھ زیادہ قصور بھی نہیں۔ میں نے تم سے

بات کرتے ہوئے معلومات فراہم کرنے والے یعنی سلمٰی کا نام چھپا لیا تھا۔''

''وہ بات کیا تھی ملک صاحب؟'' اللہ بخش نے تجسس بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

''ہاں ہاں۔ بتائیں!'' خدا بخش اضطراری انداز میں بولا۔

میں نے بتایا ''وہ مہر مشتاق اور عارف کے جھگڑے والی بات بھول گئے ہو؟''

''اوہ!'' خدا بخش گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے کہا ''میں نے جب تم سے اس جھگڑے کے بارے میں دریافت کیا تو تم نے پوچھا تھا یہ بات مجھے کس نے بتائی؟ میں نے سلمٰی کا نام ظاہر کیے بغیر تم سے سارا احوال لے لیا تھا!''

''ہاں یہ سارا واقعہ تو مجھے یاد ہے۔'' وہ جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''آپ نے کہا تھا کہ رانی کی تلاش میں آپ سلطان پورہ کے مہر خاندان کو بھی چیک کریں گے لیکن......'' جملہ ادھورا چھوڑ کر متوقف ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اب آپ بتا رہے ہیں اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ایسا کیوں ہے؟''

''فوری طور پر تو میں کوئی حتمی بات نہیں کر سکتا۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ''مگر جو حالات سامنے آ رہے ہیں ان کے حساب سے ڈاکوؤں نے یا تو چک بتیس کا رخ کیا ہے یا پھر وہ شاہکوٹ کی طرف گئے ہیں۔ شاہکوٹ کا امکان اللہ بخش نے رد کر دیا وہاں اس کا کوئی دشمن نہیں بستا۔''

پھر میں نے خدا بخش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تمہارا کوئی دشمن شاہکوٹ سے تعلق رکھتا ہے؟''

''نہ کوئی دوست اور نہ ہی کوئی دشمن!'' وہ قطعیت سے بولا ''اس طرف کبھی میرا جانا نہیں ہوا۔''

میں نے کہا ''پھر زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ شاہکوٹ کی جانب بڑھنے والے دو گھڑ سوار یعنی ایک گھوڑے پر سوار دو افراد آگے جا کر کہیں اور مڑ گئے ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ تھوڑا فاصلہ رکھ کر جنگل کے ساتھ ساتھ مغرب کی جانب بڑھ رہے ہوں اور بالآخر کسی مقام پر وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملے ہوں۔ اس قسم کی چکر بازی وہ جنگل کے جنوبی حصے میں کر چکے ہیں۔ پولیس یا پیچھا کرنے والوں کو گمراہ کرنے کے لیے وہ اس قسم کی چال چل سکتے ہیں دشمن کو بھی بے وقوف نہیں سمجھنا چاہیے۔''

PDF LIBRARY 0333-7412793

میں نے ایک لمحے کا توقف کر کے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیا اور کہا ''اگر اچانک بارش نہ ہو جاتی تو میں ڈاکوؤں کی حتمی منزل تک بھی پہنچ ہی جاتا، پھر مغوی دلہن کا سراغ لگانا چنداں مشکل نہ ہوتا لیکن بارش کو روکنا میرے بس میں نہیں تھا۔''

اللہ بخش بڑی توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ میں خاموش ہوا تو اس نے شکستہ لہجے میں سوال کیا ''آپ کا مطلب ہے اب میری بیٹی کا کوئی سراغ نہیں مل سکتا؟''

اس کے لہجے سے ایک مجبور ٹوٹے پھوٹے اور چکنا چور باپ کی شکست و ریخت جھلکتی تھی۔ میں نے توانا آواز میں کہا ''میں نے ایسی مایوسی والی تو کوئی بات نہیں کی اللہ بخش!''

وہ امید افزا نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے مزید کہا ''تمہاری بیٹی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سراغ تو اب اور بھی واضح ہو گیا ہے۔ ہم اگر چک بتیس پر توجہ مرکوز دیں تو ہمیں کامیابی مل سکتی ہے۔''

''چک بتیس؟'' اللہ بخش اچھل پڑا ''یہ تو میرا ہی چک ہے۔ رانی کو برات میں سے اغوا کر کے وہاں کون اور کیوں پہنچا سکتا ہے؟''

''کیوں کا جواب تو بعد میں بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''لیکن کون کا سیدھا سیدھا مطلب ہے تمہارا دشمن!''

''چک بتیس میں مجھ سے ایسی بھیانک دشمنی کون کرے گا؟''

''یہ تو تم ہی بتاؤ گے اللہ بخش!'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''پتا نہیں آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟'' اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔

میں نے اسے خدا بخش سے بشارت اور الیاس سے متعلق حاصل ہونے والی رنجش معلومات سے آگاہ کیا اور آخر میں کہا ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے، اس خونی واردات کے پیچھے بشارت یا الیاس کا کوئی ہاتھ ہو۔ اس امکان کو نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا!''

وہ حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات چہرے پر سجائے خاموش نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا تو میں نے استفسار کیا ''اس سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

وہ متاملانہ انداز میں بولا ''تھانے دار صاحب! یہ سچ ہے کہ میں ان باپ بیٹے کو قطعی پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے جب خدیجہ نے رانی اور بشارت کے رشتے کی بات کی تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر خدیجہ کافی دنوں تک مجھ سے ناراض بھی رہی، بہرحال میں اپنی ضد پر قائم رہا اور رانی کی شادی اپنے بھتیجے عارف سے کر دی۔''

وہ چند لحات کے لیے سانس ہموار کرنے کی خاطر رکا پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''رشتے کے اس … پر ظاہر ہے الیاس کو بھی میری ضد سے اچھی خاصی تکلیف پہنچی ہو گی لیکن اس نے کسی قابل ذکر ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہمارے درمیان پہلے بھی علیک سلیک نہیں تھی اس لیے بھی مجھے اس کی ناراضی کا احساس نہیں ہوا۔ خدیجہ نے الیاس کو رانی کی شادی میں شرکت کی دعوت دی تھی لیکن اس گھر سے ایک بچہ بھی ہماری خوشی میں شریک نہیں ہوا۔ الیاس کا غصہ اور ناراضی اپنی جگہ لیکن میرا خیال ہے رشتے کی اس معمولی 'نہ' پر الیاس یا بشارت اتنا انتہائی قدم نہیں اٹھا سکتا۔''

میں نے اپنے ذہن کی پھانس کے زیر اثر کریدے جا… رکھتے ہوئے کہا ''بعض اوقات رشتے ناتوں کے سلسلے میں … معمولی سی بات بھی کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی۔ اولاد کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے۔ ناک اور انا کے چکر میں خونریز اور سنگین واقعات کو جنم لیتے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

اس نے اس حوالے سے الیاس وغیرہ پر کوئی تبصرہ … کیا اور خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔

میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا ''میرا اندازہ ہے رانی کے رشتے سے انکار کی وجہ سے الیاس کی نسبت بشارت کو زیادہ دکھ اور تکلیف پہنچی ہو گی!''

وہ جز بز ہوا اور ہراساں نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا!''

''مجھے پتا چلا ہے، بشارت، رانی کو پسند کرتا تھا؟'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اس اوباش کا کیا ہے۔'' اللہ بخش پھٹ پڑا ''وہ تو نہیں رانی کے علاوہ بھی چک کی کتنی لڑکیوں کو گندی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسے پسند کرنا تو نہیں کہتے!'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر زہریلے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''بشارت کی ایسی ہی اوچھی حرکتوں کی وجہ سے میں … سے نفرت کرتا ہوں۔ بیٹی کا رشتہ دینا تو دور کی بات ہے میں ان باپ بیٹے کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں ہوں۔''

بات کے اختتام پر اس نے ایسا منہ بنایا جیسے اس کے … سے کوئی کڑوی کسیلی شے نیچے اتر گئی ہو۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ الیاس اور بشارت کے لیے اپنے دل … کس قدر ناپسندیدگی اور غصہ رکھتا تھا۔

میں نے نہایت محتاط الفاظ میں ایک حساس سوال کیا ''… کا برا نہیں منانا اللہ بخش! یہ بات میں اس حوالے سے … رہا ہوں کہ تمہاری بیوی کی خواہش تھی کہ اپنی بیٹی کی … سے کر دے۔ اس سلسلے میں ظاہر ہے رانی سے بھی … بات چیت ہوتی ہو گی۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر … ہوئے انداز میں دریافت کیا۔ ''کیا رانی بھی بشارت کو پسند کرتی تھی؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ چیخ کر بولا۔ یہ الفاظ ادا … ہوئے اللہ بخش کے جبڑوں نے ایسے زاویے سے … کی جیسے وہ بشارت کو کچا چبا رہا ہو، پھنکار سے مشابہ آواز … نے کہا ''میں اپنی بیٹی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اس … بات کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ … کردار کسی سے چھپا ہوا نہیں۔''

میں نے اس کے دعوے کو چیلنج نہیں کیا۔ وہ اس وقت غم و … کی لپیٹ میں تھا، وہ اس بات کی متقاضی تھی کہ … کے جذبات اور احساسات کو کم سے کم نخ کیا جائے۔ … ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اولاد کے اس نوعیت کے … کے بارے میں اکثر والدین اندازہ لگانے میں غلطی … ہیں اور ازاں بعد ان کا دعویٰ جھوٹا پڑ جاتا ہے۔ خدا ہر … اولاد خصوصاً 'بیٹیوں' والوں کو درست انداز سے قائم … کی توفیق عطا فرمائے!

میں نے بات چیت کے زاویے کو تھوڑا تبدیل کرتے … کہا ''اللہ بخش! حالات و واقعات اس وقت جو نقشہ … رہے ہیں اس کی حدود و قیود کا تقاضا ہے کہ الیاس … بشارت کو اچھی طرح چیک کیا جائے۔''

''آپ چاہے جس کو بھی چیک کریں۔'' وہ روہانسی آواز … ''جو بھی کریں تھانے دار صاحب! لیکن خدارا کسی … میری رانو مجھے واپس لا دیں۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ …''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کے … اور تسلی آمیز لہجے میں کہا ''تم فکر نہ کرو اللہ بخش! میں … تمہاری بیٹی کو بازیاب کر لوں گا۔''

… میں خدا بخش سے مخاطب ہوا اور کہا ''تمہارا غم اپنی … میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، تمہارے جوان جہان بیٹے … جلد ہی میری گرفت میں ہو گا، پھر کوئی اسے سخت ترین … نہیں بچا سکے گا۔ تم دونوں آپس ہی تسلی دلاسے سے خود کو … کی کوشش کرو۔''

وہ ممنونیت ریز الفاظ میں بار بار میرا شکریہ ادا کرنے لگے۔

''اللہ بخش!'' میں نے دلہن کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا ''تم واپس جاؤ اور چک بتیس میں رہتے ہوئے اپنی آنکھوں اور کانوں کو کھلا رکھو۔ اگر تمہیں الیاس یا بشارت کے بارے میں کوئی بھی اہم بات معلوم ہو تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔ ویسے میں بھی پہلی فرصت اُدھر کا چکر لگانے والا ہوں۔''

میں نے لمحاتی توقف کیا پھر پوچھا ''کیا وہ دونوں باپ بیٹا اس وقت چک بتیس ہی میں ہیں نا؟''

''مجھے ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں جناب۔'' وہ بیزاری سے بولا ''ان سے میرا میل جول نہیں۔ جس گاؤں نہ جانا ہو اس کے کوس گننے کا کیا فائدہ!''

میں نے بڑی رسانیت سے کہا ''اگر تم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو جاننے کی کوشش کرو۔ اس طرح کوئی مفید بات نکل کر سامنے آئے گی۔ ان شاء اللہ جلد ہی چک بتیس میں ہماری ملاقات ہو گی۔''

''میں ذرا چک چوراسی جا کر پہلے اپنی بھابی سے تعزیت کر لوں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''سلمیٰ کی خیر خیریت بھی دریافت کرنا ہے۔ میں شام تک ہی واپس جا سکوں گا۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے انہیں آپ کمرے سے رخصت کر دیا۔

پھر میں نے حوالدار خیر خان کو اپنے پاس بلایا اور اسے ہدایت کی کہ چک بتیس اور چک چوراسی سے تعلق رکھنے والے جو افراد اس وقت تھانے میں موجود ہیں ان میں سے چھانٹ کر دو چار افراد سے وہ پوچھ گچھ کرے۔ اللہ بخش اور خدا بخش کو چھوڑ کر۔ ہو سکتا ہے کوئی اہم نکتہ ہاتھ آ جائے!

شام سے تھوڑی دیر پہلے اے ایس آئی ظاہر علی واپس آ گیا۔ اس نے چک بتیس کی جو رپورٹ پیش کی اس کے مطابق الیاس اپنے گھر میں موجود تھا مگر بشارت کو پورے چک میں کہیں نہیں دیکھا گیا۔ اس نے مختلف لوگوں سے بشارت کے بارے میں جو معلومات اکٹھا کیں ان کی رو سے بشارت دس اکتوبر کی صبح چک بتیس سے نکل گیا تھا۔ ایک دو افراد نے یہ شک بھی ظاہر کیا کہ بشارت دوپہر میں انہیں چک میں دکھائی دیا تھا تاہم اس سے ان کی بات چیت نہیں ہوئی۔ ظاہر علی نے الیاس کو ٹچ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور یہ میری ہی ہدایت کا نتیجہ تھا۔ میں دیکھ بھال کر ان لوگوں پر پکا ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔ اگر وہ واقعی ان جرائم میں ملوث تھے تو کچا ہاتھ ڈالنے سے کسی چکنی مچھلی کے مانند ہاتھ سے پھسل بھی سکتے تھے!

دس اکتوبر وہی تاریخ تھی جب چک بتیس میں عارف اور رالفہ کا نکاح ہوا تھا۔ آج گیارہ اکتوبر کا دن تھا۔ عین شادی کے روز بشارت کا چک سے کہیں چلے جانا ذہن میں بہت سے سوالات کو جنم دیتا تھا۔ یہ بات بھی خاصی چونکا دینے والی تھی کہ آج دوپہر میں وہ چند افراد کو چک میں نظر بھی آیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں میرا فوراً چک بتیس میں جا کر الیاس کو "ٹٹولنا" ضروری ہو گیا۔

اس وقت رات ہو رہی تھی۔ میں نے اگلی صبح ادھر روانہ ہونے کا فیصلہ کیا اور تھانے کے دیگر کاموں میں مصروف ہو گیا۔ سلطان پورہ کی طرف سے کوئی اچھی بری اطلاع ابھی تک موصول نہیں ہوئی تھی اس کا واضح مطلب یہی تھا وہاں "امن وامان" قائم تھا۔ میں نے کانسٹیبل منظور علی کو ہدایت کر رکھی تھی کہ اگر وہ مہر خاندان کی طرف کوئی خاص سرگرمی دیکھیں تو مجھے مطلع کریں ورنہ اپنے کام سے لگے رہیں۔ ویسے ڈاکوؤں کا جنگل کے جنوبی حصے کی طرف بڑھنا اپنی حقیقت کھول چکا تھا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر کل شام تک سلطان پورہ سے اس واردات سے متعلق کوئی سراغ نہیں ملتا تو میں اپنے بندوں کو وہاں سے ہٹا لوں گا۔

☆☆☆

اگلی صبح خاصی مصروف اور ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ میں معمول کے مطابق تیار ہو کر تھانے پہنچا تو اسپتال سے مقتول عارف کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش آ گئی۔ لاش کے ساتھ ہی رپورٹ بھی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول دولہا کی موت دس اکتوبر کی رات آٹھ اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب دل میں پیوست ہونے والی گولی کو قرار دیا گیا تھا۔ قتل، ڈکیتی اور اغوا والی واردات لگ بھگ نو بجے رات عمل میں آئی تھی۔ دل میں اترنے والی گولی انسان کو زیادہ سانسوں کی مہلت نہیں دیتی۔ میرے اندازے کے مطابق عارف گولی کھانے کے بعد پانچ دس منٹ میں ٹھنڈا ہو گیا ہو گا۔

میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد دولہا کی لاش ورثا کے حوالے کر دی۔ شادی والا گھر تو پہلے ہی ماتم خانہ بنا ہوا تھا۔ لاش وہاں پہنچی تو ایک کہرام بپا ہو گیا۔ اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی کہ تدفین وغیرہ میں چک بتیس کے لوگ خصوصاً اللہ بخش ضرور شرکت کرنے آئے گا۔ میری معلومات کے مطابق عصر کے بعد جنازہ اٹھایا جاتا۔

میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور حوالدار خیبر خان کے ساتھ چک بتیس روانہ ہو گیا۔

ایک بات کا ذکر کرنا میں شاید بھول گیا ہوں۔ اسپتال جا کر ان لوگوں کے بیانات قلم بند کرنے کا موقع جو اس واردات کے نتیجے میں شدید زخمی ہو گئے تھے۔ ان کی ضروری مرہم پٹی کر دی گئی تھی اور اب حالت خطرے سے باہر تھی۔ حبیب اللہ، عمر دین اور رفیق تقریباً ملتا جلتا بیان دیا۔ ان کے مطابق ڈاکو اچانک ہی جنگل سے برآمد ہو کر برات پر حملہ آور ہو گئے تھے۔ وہ سب مسلح تھے۔ کسی نے ان کی آواز سنی اور نہ ہی چہرہ دیکھا۔ انہوں نے سیاہ لباس پہن رکھے تھے اور چہروں پر بھی ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے زبان سے ایک ادا نہ کیا اور برات پر ہلا بولتے ہی دھواں دھار انداز فائرنگ شروع کر دی۔ چند سیکنڈ بعد وہ اپنا کام کر کے تاریک جنگل میں غائب ہو چکے تھے۔ برات والوں پر یہ اتنی اچانک نازل ہوئی کہ ان کی مت ہی ماری گئی تھی۔ براتیوں کے ہوش بجا ہوئے تو صورت حال ان پر آشکار ہوئی اب وقت ان کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔

تینوں زخمیوں سے ایسی کوئی بات پتا نہ چلی جو ڈاکوؤں شناخت یا ان تک رسائی کا سبب بن سکتی۔ میں نے خاص طور باری باری ان سے یہ سوال کیا کہ ڈاکوؤں نے صرف ان تین مسلح افراد کو ہی شدید زخمی کیوں کیا۔ ان کے پاس میرے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا تاہم انہوں نے میری اس سے اتفاق ضرور کیا کہ ڈاکوؤں کو یہ اطلاعات تھیں کہ برات میں کس کس کے پاس آتشیں اسلحہ موجود ہے، زیورات صندوق کس بیل گاڑی پر رکھا گیا ہے اور دولہا کس گھوڑے پر برات میں کس جگہ موجود ہو گا۔

ان تینوں کے بیانات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ کہ یہ واردات ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھی۔ مجھے سازش کے مرکزی کردار تک پہنچنا تھا۔ اگر وہ میرے ہاتھ جاتا تو پھر دولہا کا قاتل مجھ سے دور رہتا اور نہ ہی دلہن دور!

ہم دوپہر سے پہلے چک بتیس پہنچ گئے۔ سب سے پہلے ہم نے اللہ بخش کے گھر کا رخ کیا۔ گزشتہ روز تھانے میں بخش نے مجھے بتایا تھا وہ رات تک گھر پہنچ جائے گا۔ قوی یہی تھی کہ وہ ہمیں گھر پر مل جائے گا لیکن بعض اوقات امیدیں بھی پانی کا بلبلہ ثابت ہوتی ہیں۔ چک بتیس میں بخش کے گھر سے معلوم ہوا کہ وہ رات چک چوراسی سے واپس نہیں آیا۔ آج عصر کے بعد عارف کی تدفین تھی لہٰذا آج اس کی واپسی ممکن نظر نہیں آتی تھی۔

میں حوالدار کے ساتھ الیاس کے گھر کی طرف روانہ الیاس بھی چک بتیس کا رہائشی تھا۔ اس کا گھر تلاش کرنے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس وقت اپنے گھر میں موجود تھا۔ اس نے ہمیں گھر کی کشادہ بیٹھک میں بٹھایا۔

اس بیٹھک کی سجاوٹ اور وہاں پر رکھے ہوئے سامان الیاس ایک کھاتا پیتا اور خوشحال شخص تھا۔ کرسیوں کے علاوہ ایک صوفہ سیٹ بھی وہاں رکھا نظر آ رہا دیواروں پر خاندانی بزرگوں کی فریم شدہ تصاویر آویزاں مغربی دیوار پر کسی شیر یا چیتے کی کھال کو پھیلا کر لٹکایا گیا کے نیچے دو شکاری رائفلیں ضرب کا نشان بنا رہی تھیں۔ وہ درندہ الیاس کا شکار کردہ تھا یا اس کے آباؤ اجداد میں کسی نے یہ کارنامہ انجام دے رکھا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا دیوار پر آویزاں وہ کھال محض چرم سازی کا کوئی شاہکار نمونہ

ہم اس وقت سرکاری وردی میں تھے لہٰذا الیاس کا ماتھا ہو گا۔ وہ ہمیں بڑی شرافت سے بیٹھک میں تو لے آیا اس کے چہرے پر سوالات کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا۔ نے اس کی تکلیف دور کرنے کی خاطر اپنا تعارف کروا دیا۔

"میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ میں اس علاقے کا انچارج ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں چک چوراسی، چک بتیس، سلطان پورہ اور شاہکوٹ وغیرہ تھانے کی حدود ہی میں آتے ہیں۔" ایک لمحے کے سے میں نے خیبر خان کی طرف اشارہ کیا اور کہا "یہ الدار خیبر خان ہے۔"

الیاس نے اٹھ کر ایک مرتبہ پھر مجھ سے مصافحہ کیا لیکن کے مصافحے میں وہ گرمجوشی موجود نہیں تھی حالات جس کے ضی تھے۔ وہ گونجدار آواز میں بولا۔

"میں نے آپ کا نام تو سن رکھا ہے لیکن روبرو ملاقات لی مرتبہ ہو رہی ہے۔" تھوڑا رک کر اس نے اضافہ کرتے ئے کہا "آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ بڑے کڑک نے دار ہیں!"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے "تم نے ٹھیک ہی سنا ہے۔ میں اصولوں پر سودے بازی کرتا۔ اپنے فرائض کی بجا آوری میں، میں بڑا سخت ہوں۔"

وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا "بالکل بالکل...... یہ تو اچھی بات ہے۔ ایک تھانے دار کو ایسا ہی اصول پرست ض شناس ہونا چاہیے۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔"

اس کا آخری جملہ بالکل کھوکھلا اور بھرتی کا تھا۔ اس کی کسی ادا، کسی تیور سے خوشدلی کا اشارہ نہیں ملتا تھا۔ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"الیاس! ممکن ہے اس ملاقات کے آخر میں تمہیں اپنے بیان کو تبدیل کرنا پڑے!"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا "میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں!"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے اسے سمجھایا "جب تمہیں ہماری آمد کی غرض وغایت کا پتا چلے گا تو تم یہ کہنے کی توفیق سے محروم ہو چکے ہو...... آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے!"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تاہم خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا "ملک صاب! آپ بہت الجھی ہوئی اور ڈرانے والی باتیں کر رہی ہیں۔"

"الجھی ہوئی ہر بات کی تو میں وضاحت کر دوں گا۔" میں نے بدستور اس کے چہرے پر نگاہ جمائے رکھی "لیکن اگر تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا تو پھر مجھ سے ڈرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ میں صرف مجرموں کے ساتھ سختی برتتا ہوں۔ شریف النفس اور امن پسند لوگوں کے ساتھ میں محبت اور نرمی کا برتاؤ کرتا ہوں اور اگر ان میں سے کوئی تھانے آ جائے تو میں بصد احترام اسے بیٹھنے کے لیے کرسی بھی پیش کرتا ہوں۔"

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔ ایک لمحے کے لیے اس نے متاملانہ انداز میں مجھے دیکھا پھر اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا "میں آپ لوگوں کے لیے چائے پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔"

"اس بندوبست کی کوئی ضرورت نہیں الیاس۔" میں نے قدرے بلند اور حتمی لہجے میں کہا "ہم یہاں تم سے خاطر تواضع کرانے نہیں آئے بلکہ تم سے دوٹوک بات کرنے آئے ہیں لہٰذا چپ چاپ بیٹھے رہو اور میں جو سوال کروں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔"

میرے لہجے سے چھلکتی سنگینی کو اس نے پوری وضاحت سے محسوس کر لیا۔ وہ کھٹک سے وہیں بیٹھ گیا جہاں سے اٹھا تھا پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بے بسی سے بولا "جی فرمائیں تھانے دار صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"میں نے فی الفور اندازہ لگایا اسے میرا اسٹائل پسند نہیں آیا تھا لیکن مجھے اس کی پسند یا ناپسند کی قطعی کوئی پروا نہیں

تھی۔ میں نے نہایت ہی مختصر، موثر اور پائیدار الفاظ میں اسے اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کر دیا۔ پوری بات سنتے ہی وہ بھڑک اٹھا۔

"کیا...... آپ...... ہمیں اس واردات کا...... ذمے دار ٹھہرا رہے ہیں؟"

"میں نے وہ حقیقت بیان کی ہے، حالات جس سمت اشارہ کر رہے ہیں۔" میں نے خالص تھانے دارانہ انداز میں کہا۔ "اللہ بخش اور تمہارے درمیان پائی جانے والی رنجش کسی سے ڈھکی چھپی نہیں، پھر رانی کے رشتے سے انکار کے بعد تو اللہ بخش کے لیے تمہارے دل میں موجود نفرت اور بھی بڑھ گئی ہوگی لہٰذا......"

"سب بکواس ہے۔" وہ میری بات پوری ہونے سے ہی طیش کے عالم میں بولا "انکار تو اس وقت ہوتا اگر میں اس گھر میں اپنے بیٹے کا رشتہ لگاتا۔ وہ تو میری معصوم بہن کی ایک خواہش تھی جسے اس سنگ دل شخص نے اپنے قدموں تلے روند ڈالا۔"

سنگ دل شخص سے اس کی مراد اللہ بخش تھی۔ اللہ بخش کے لیے اس کے ایک ایک لفظ سے زہر کی بوندیں ٹپکی تھیں۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ وہ اللہ بخش سے شدید نفرت رکھتا تھا۔ اس کا ذکر سنتے ہی وہ جس طرح چراغ پا ہوا تھا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا غیظ و غضب بقول کسے ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "کچھ بھی ہے الیاس! لیکن اس وقت تم دونوں باپ بیٹے کی پوزیشن بہت نازک ہو چکی ہے۔ میں سچ کو سامنے لا کر ہی رہوں گا۔"

"آپ خواہ مخواہ مجھے اور میرے بیٹے کو ایک جھوٹے کیس میں پھنسانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" وہ پاؤں پٹختے ہوئے بولا "عارف کے قتل یا رانی کے اغوا سے ہمارا کوئی تعلق واسطہ نہیں بلکہ......" وہ لمحے بھر کو خاموش ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بھاری آواز میں بولا۔

"بلکہ مجھے اس واقعے کا دلی افسوس ہوا ہے۔ اللہ بخش سے اختلافات رہے ایک طرف مگر یہ میری بہن کی بیٹی کا بھی معاملہ ہے۔ میری خواہش ہے رانی جلد از جلد بازیاب ہو جائے۔ بشارت اسی سلسلے میں گھر سے نکلا ہوا ہے۔"

الیاس کے آخری جملے نے مجھے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اضطراری انداز میں سوال کیا "بشارت کہاں گیا ہوا ہے؟"

"میں نے بتایا ہے نا، وہ رانی کی تلاش میں نکلا ہوا ہے۔"

"کب...... کدھر......؟" بے ساختہ میری زبان سے خارج ہوا۔

الیاس نے جواب دیا "کدھر کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ یہ ضرور بتا سکتا ہوں، وہ گیارہ اکتوبر کی دوپہر کو یہاں سے روانہ ہوا ہے اور آج بارہ اکتوبر ہے۔ اسے گئے ہوئے لگ بھگ چوبیس گھنٹے گزر گئے ہیں۔ اب تو مجھے اس کی طرف سے بھی فکر ہونے لگی ہے۔ وہ گلے میں بندوق لٹکا کر گھوڑے پر سوار ہو کر گھر سے نکلا تھا۔ اللہ اسے محفوظ رکھے۔"

ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے الیاس مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہا ہو۔ اے ایس آئی نے مجھے بشارت کے بارے میں جو رپورٹ دی تھی اس کے مطابق وہ دس اکتوبر کی صبح چک بتیس سے نکلا تھا۔ پھر گیارہ اکتوبر کی دوپہر اسے دوبارہ مذکورہ چک میں دیکھا گیا۔ اس کے بعد سے وہ اب تک غائب تھا۔ میں نے الیاس کو گھمانے کے لیے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

"تمہارے بیان کے مطابق وہ گزشتہ روز دوپہر کے وقت رانی کو ڈھونڈنے کے لیے گھوڑے پر سوار ہو کر گھر سے نکلا تھا۔ اس سے پہلے وہ کہاں تھا؟"

"اس سے پہلے؟" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "ہاں اس سے پہلے! میری معلومات کے مطابق تمہارا بیٹا بشارت دس اکتوبر کی صبح چک بتیس سے نکلا تھا اور اس کی واپسی گیارہ اکتوبر کی دوپہر کو ہوئی تھی۔ بتاؤ اس دوران میں وہ چک سے باہر کیوں رہا؟"

"اوہ! آپ یہ پوچھ رہے ہیں۔" وہ ایک طویل اور اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا "وہ اقبال نگر گیا تھا ایک دن کے لیے۔"

اقبال نگر چک بتیس سے کوئی پندرہ سولہ میل دور مغرب میں واقع تھا۔ یہ علاقہ میرے تھانے کی حدود سے باہر تھا۔ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اپنے سامنے بیٹھے الیاس کو دیکھا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"بشارت اقبال نگر کیا لینے گیا تھا؟"

"وہاں میری بڑی بیٹی رہتی ہے۔" الیاس نے بتایا "وہ اپنی آپا سے ملنے گیا تھا۔ کل دوپہر کو جب وہ واپس آیا تو اسے برات کو پیش آنے والے واقعے کی خبر ہوئی۔ اس کی سانس چڑھ گئی اور دماغ سنسنانے لگا۔ مجھ سے بولا 'ابا! رشتہ جڑنا اور ٹوٹنا تو نصیب کی بات ہے۔ اگر رانی کی شادی مجھ سے نہیں ہو سکی تو کیا ہوا وہ میری پھوپی کی بیٹی تو ہے نا۔ ڈاکو زبردستی اسے

کر کے اٹھا لے گئے ہیں۔ میں چوڑیاں پہن کر گھر میں نہیں بیٹھ سکتا۔ ابا! آپ کا اور پھوپا کا جو جھگڑا ہے وہ آپ بعد میں نمٹاتے رہنا۔ میں تو چلا۔' یہاں تک پہنچ کر اس نے لمحے بھر کی خاموشی اختیار کی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فخریہ لہجے میں بولا۔

"میں نے بشارت کو جانے سے نہیں روکا۔ اس کے جذبے نے مجھے متاثر کیا تھا۔ جوانی میں میں بھی ایسا ہی بڑا دلیر، نڈر اور پرعزم ہوا کرتا تھا۔" اس نے ایک نظر دیوار پر ٹنگی برچھی، کمان اور رائفلوں کو دیکھا اور بولا "بہادری اور شجاعت ہمارا خاندانی طرۂ امتیاز ہے۔ اللہ میرے بیٹے کی حفاظت کرے۔"

الیاس نے بشارت کے حوالے سے جو کچھ بتایا تھا اگر وہ مبنی برحقیقت تھا تو واقعی اس نوجوان کا جذبہ قابل صد ستائش تھا۔ میں چند لمحات تک کھوجتی ہوئی نظر سے اسے دیکھتا رہا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"الیاس! تم یہ نہ سمجھنا میں آنکھیں بند کر کے تمہاری کہانی پر یقین کر لوں گا۔"

وہ مضبوط لہجے میں بولا "خیر سے بشارت گھر آ جائے۔ آپ خود اس کی زبانی یہ کہانی سن لینا۔"

"وہ تو میں سنوں گا ہی۔" میں نے کہا "لیکن بشارت کی واپسی سے پہلے میں اقبال نگر جا کر اس بات کی تصدیق ضرور کروں گا کہ تمہارا بیٹا وہاں اپنی آپا سے ملنے گیا تھا یا نہیں...... اور اپنی بیٹی اور داماد کا نام پتا تم مجھے دو گے؟"

"ضرور...... ضرور۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور میری مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔

الیاس کی بڑی بیٹی نازو اور اس کا شوہر طفیل اقبال نگر کے شرقی حصے میں رہائش پذیر تھے۔ طفیل ایک صاحب ثروت شخص تھا۔ اقبال نگر کی غلہ منڈی میں اس کی آڑھت کا کاروبار تھا۔

میں جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور وارننگ دینے والے انداز میں الیاس سے کہا "جب تک تمہاری بھانجی رانی بازیاب نہیں ہو جاتی تم چک بتیس سے باہر قدم بھی نہیں نکالو گے اور......" میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر گھورتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔

"جب تمہارا وہ غیرت مند جیالا بشارت اپنی مہم سے واپس آ جائے تو اسے اپنے ساتھ لے کر فوراً میرے پاس تھانے آ جانا۔ میں تمہارے بہادر سپوت سے مل بھی لوں گا اور وہیں اس کا بیان بھی قلم بند کر لیا جائے گا!"

اس نے میری تاکید کی پیروی کرنے کا وعدہ کیا۔ میں حوالدار کے ساتھ اس کے گھر سے باہر نکل آیا۔

"ملک صاحب! اب کس طرف جانے کا ارادہ ہے؟" خیر خان نے چک سے باہر آتے ہوئے کہا۔

"اقبال نگر!" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

ٹھیک دس منٹ بعد ہم چک سے نکل کر اس کچے راستے پر پہنچ گئے جو وہاں سے مغرب میں اقبال نگر کو جاتا تھا۔ چک بتیس اور اقبال نگر میں کم و بیش پندرہ میل کا فاصلہ حائل تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک تانگے میں بیٹھے اقبال نگر کی سمت جا رہے تھے۔

میں سیدھا اس علاقے کے تھانے میں پہنچا اور وہاں کے انچارج کو پوری تفصیل کے ساتھ صورت حال سے آگاہ کیا۔ تھانہ انچارج اسلم راجپوت میرا شناسا تھا۔ ہمارے درمیان اچھی یاد اللہ تھی۔

وہ بولا "ڈاکوؤں والی اس واردات کے بارے میں ایس پی آفس سے مجھے بھی کچھ بھنک تو ملی تھی مگر تفصیل آپ نے بتائی ہے تو اس کا نقشہ ذہن میں واضح ہوا ہے۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا وہ ضرور کروں گا ملک صاحب! آپ حکم کریں۔"

"راجپوت صاحب! شرمندہ نہ کریں۔" میں نے اس کے اخلاق کے مظاہرے کے جواب میں عاجزی اختیار کرتے ہوئے کہا "بس میں تو اتنا پتا چلانے آیا ہوں کہ آیا بشارت دس اکتوبر کو اقبال نگر میں اپنی بہن کے گھر آیا تھا یا نہیں؟"

وہ معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا "آپ کو اب کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے عملے کے ایک ہوشیار اہلکار سے آپ کی مطلوبہ معلومات حاصل کروا کے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اس طرح طفیل یا نازو کو کوئی شک بھی نہیں ہوگا کہ دوسرے علاقے کا کوئی تھانے دار ان کے بارے میں تفتیش کرتا ہوا یہاں پہنچا ہے۔"

اسلم راجپوت کی تجویز بڑی معقول تھی لہٰذا میں نے فوراً اس سے اتفاق کر لیا۔

اس نے ایک قابل بھروسا اہلکار کو ضروری ہدایت دے کر بشارت کی بہن نازو کے گھر کی طرف روانہ کر دیا پھر ہمارے لیے دوپہر کے کھانے کے بندوبست میں لگ گیا۔

اس وقت ہمیں واقعی ٹھیک ٹھاک بھوک لگ رہی تھی۔ لہٰذا پہلی تجویز کی طرح راجپوت کی کھانے کی پیشکش بھی بڑی معقول اور پرکشش تھی چنانچہ ایک مرتبہ پھر ہم پر اتفاق لازم ہو گیا۔

جب تک ہم کھانے سے فارغ ہوتے، راجپوت کا بندہ

ضروری معلومات حاصل کر کے واپس آ گیا۔ اس کی فراہم کردہ اطلاعات انتہائی چونکا دینے والی اور سنسنی خیز تھیں۔ بشارت نے پچھلے ایک ماہ سے اقبال نگر کی دھرتی پر قدم بھی نہیں رکھا تھا۔

"کیا تم نے اچھی طرح اس بات کی تصدیق کر لی؟" میں نے اطلاع لانے والے سے استفسار کیا۔

وہ یقین سے بولا "ایک سو ایک فی صد اور پورے سولہ آنے جناب!"

اسلم راجپوت نے کہا "ملک صاحب! مجھے یقین ہے، اس بشارت نامے بندے کا اس واردات سے کوئی گہرا تعلق ہے۔"

"شک تو مجھے بھی یہی رہا تھا لیکن اب اس کا جھوٹ پکڑے جانے کے بعد میرا شک یقین میں بدل گیا ہے۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس وقت ذہن تیز رفتاری سے اس کیس کی کڑیاں ملانے میں مصروف تھا۔

"اگر آپ بشارت کو کسی طرح ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں تو لڑکی برآمد کرائی جا سکتی ہے۔" اسلم راجپوت نے ٹھہرے ہوئے بامعنی انداز میں کہا۔

"کچھ کرتے ہیں راجپوت صاحب!" یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ٹھیک دس منٹ بعد ہم واپسی کے سفر کے لیے تھانے سے رخصت ہو رہے تھے۔

حوالدار خیبر خان کا اصرار تھا، ہمیں واپس چک بتیس جا کر الیاس کو اس جھوٹ پر جوتے لگانا چاہئیں لیکن میں قدرے مختلف انداز میں سوچ رہا تھا۔ ہم چک بتیس گئے ضرور لیکن میں نے بڑے دوستانہ انداز میں الیاس کو جا کر بتایا کہ اقبال نگر سے میں نے اس کے بیان کی تصدیق کر لی ہے۔

"میں تو پہلے کہہ رہا تھا" وہ بے ساختہ بولا۔

میں نے کہا "الیاس! تم اچھے بھلے سیانے سمجھدار آدمی ہو ہم دوسروں کی کہی ہوئی بات کو بغیر پرکھے سچ نہیں مان سکتے۔ قانون کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں ہمیں کاغذات کا پیٹ بھرنے کے علاوہ اوپر بھی جواب دینا ہوتا ہے۔"

میں یہ تمام حرکتیں ایک خاص منصوبے کے تحت کر رہا تھا یہ گویا شکار کی ہوئی مچھلی کو تلنے سے پہلے مسالا لگانے کے مترادف تھا۔ میں نے اس کی باتوں سے یہ اندازہ تو لگا لیا کہ وہ بیٹے کے جھوٹ سے واقف نہیں تھا۔ بشارت نے اسے بھی یہی بتایا ہوگا کہ دس اکتوبر کو وہ اقبال نگر جا رہا تھا۔ وہ اس جھوٹ کی آڑ میں کیا کیا تماشے دکھا رہا تھا یہ جاننے کے لیے الیاس کو مطمئن کرنا بھی ضروری تھا تاکہ بنا بنایا کھیل کسی مرحلے پر بگڑ نہ جائے۔

اس نے میری معروضات کے جواب میں کہا "آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب! میں آپ کی مجبوریوں کو سمجھ سکتا ہوں۔ آپ ہماری طرف سے بے فکر ہو جائیں۔ ہمارے ہاتھ صاف ہیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ رانی جلد از جلد بازیاب ہو جائے۔ چاہے بشارت اسے ڈھونڈ نکالے یا پولیس، اس سے کیا فرق پڑتا ہے!"

"واقعی، کوئی فرق نہیں پڑتا" میں نے اس کی سوچ پر بے خبری کے اطمینان کی ایک اور تہہ چڑھاتے ہوئے کہا "اگر بشارت واپس آ جائے تو تم فوراً اسے میرے پاس لے آنا ہو سکتا ہے، اس کی جنگل نوردی اور تلاش ہماری تفتیش کے لیے معاون ثابت ہو!"

وہ پوری طرح میرے شیشے میں اتر گیا تو میں اس سے پرجوش مصافحہ کرنے کے بعد وہاں سے چلا آیا حوالدار کی الجھن میں نے واپسی کے راستے میں دور کر دی تو وہ شانت ہو گیا۔

"ملک صاحب! آپ نے بڑی زبردست پلاننگ کی ہے!" وہ تعریفی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ اس وقت میں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

اسی شام واپس تھانے پہنچ کر میں نے چار چار اہلکاروں پر مشتمل تین پولیس پارٹیاں ترتیب دیں اور انہیں بشارت کی تلاش میں پورے علاقے میں پھیل جانے کا حکم دیا۔ اگر ڈاکوؤں والی واردات میں بشارت ملوث تھا تو پھر وہ رانی کے بارے میں جانتا تھا اور یہ بھی ضروری تھا کہ اسے علاقے سے باہر نکل کر بھی ڈھونڈا جائے میں نے اگلی صبح اسے ڈھونڈنے کا بھی انتظام کر دیا۔

تیرہ اکتوبر کا پورا دن کسی اچھی خبر کے انتظار میں گزر گیا۔ بشارت اور رانی کا کوئی سراغ ہاتھ نہ آیا۔ گزشتہ روز عصر کے بعد عارف کی تدفین ہو گئی تھی اور چک بتیس والوں میں سے اکثر کل شام اور کچھ آج صبح واپس چلے گئے تھے جاتے وقت اللہ بخش تھانے آ کر مجھ سے ملا تھا۔ میں نے اقبال نگر والے معاملے سے اسے بے خبر رکھتے ہوئے تسلی تشفی دے کر رخصت کر دیا۔

آئندہ روز یعنی چودہ اکتوبر کو ایک حیرت انگیز اور ناقابل یقین خبر سننے کو ملی میں اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھا رانی کے اغوا کی ڈور کو سوچ بچار کی انگلیوں سے سلجھانے کی کوشش میں مصروف تھا حوالدار نے اندر آ کر اطلاع دی۔

"ملک صاحب! چک بتیس سے الیاس اور اس کا بیٹا بشارت آپ سے ملنے آئے ہیں!"

حوالدار کے انداز سے دبا دبا جوش جھلکتا تھا۔ میں اسے اپنی پلاننگ سے اچھی طرح آگاہ کر چکا تھا لہٰذا کسی بریفنگ کی

مزید ضرورت نہیں تھی۔ میں نے آنکھ دبا کر مخصوص انداز میں اشارہ دیا اور کہا "ٹھیک ہے، انہیں میرے پاس بھیج دو۔"

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں باپ بیٹا میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حوالدار خیبر انہیں کمرے میں پہنچانے کے بعد بشارت کے عقب میں مستعد کھڑا ہو گیا تو میں ان کی طرف متوجہ ہوا۔

الیاس نے بڑے فخریہ انداز میں مجھے اپنے بیٹے کے کارنامے سے آگاہ کیا جس کے مطابق بشارت تلاش بسیار کے بعد رانی کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ معلومات انکشاف انگیز ہونے کے ساتھ ہی تہلکہ خیز بھی تھیں لیکن میں نے اپنی حرکات و سکنات سے کسی قسم کا اضطرار ظاہر نہ ہونے دیا اور گمبھیر لہجے میں بشارت سے پوچھا۔

"رانی اب کہاں ہے؟"

وہ توقع کر رہے ہوں گے، میں ان سے دریافت کروں گا رانی اسے کہاں سے ملی میرے اس غیر متوقع سوال نے بشارت کو گڑبڑا دیا۔ وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا "وہ...... وہ اپنے گھر میں ہے۔ میرا مطلب ہے، پھوپھو خدیجہ کے پاس ہے......"

میں اس دوران میں گہری نظر سے بشارت کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی عمر چھبیس سال کے قریب رہی ہوگی۔ آنکھوں سے مکاری مترشح تھی۔ صحت قابل رشک اور انداز لفنگوں ایسا۔ وہ بڑی سرعت سے آنکھیں گھمانے کا عادی تھا۔

میں نے سہلانے والے انداز میں کہا "برخوردار! ڈاکوؤں کے چنگل سے رانی کو چھڑانے کے لیے تمہیں اپنی جان کو جوکھم میں ڈالنا پڑا ہوگا۔ تمہیں زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟"

"نہیں جناب! آپ کی دعا سے میں صحیح سلامت یہاں بیٹھا ہوں" وہ عیاری سے بولا "ڈاکو بہت بزدل ثابت ہوئے۔ میں نے ہوائی فائرنگ کر کے انہیں ایسا دہشت زدہ کیا کہ وہ جدھر منہ اٹھا فرار ہو گئے۔ میں رانی کو اپنے گھوڑے پر بٹھا کر چک بتیس لے آیا ہوں۔ خدیجہ پھوپھو اور پھوپھا اللہ بخش بہت خوش ہیں۔"

میں نے اس کی فریبی باتوں کے جواب میں سخت لہجے میں کہا "تم ڈاکوؤں کے پاس سے تو صحیح سلامت لوٹ آئے ہو لیکن یہاں جو کچھ تمہارے ساتھ ہونے والا ہے، مجھے نہیں امید اس کے بعد تم سلامت رہ سکو...... کیونکہ یہاں ہوائی نہیں بلکہ بالکل اوریجنل چھترول ہوگی"

"یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟"

الیاس جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا "آپ کو تو چاہیے، بشارت کو کوئی انعام شنام دیں مگر......"

"مجھے تھانے داری سکھانے کی کوشش مت کرو الیاس!" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی گرج کر کہا "تم خاموش بیٹھو ورنہ اس بدمعاش کے ساتھ تم بھی سوکھے رگڑے جاؤ گے۔"

باپ کی توہین ہوتے دیکھ کر بشارت تلملا اٹھا "آپ نے ہمیں سمجھ کیا رکھا ہے؟"

"ابھی بتاتا ہوں" اتنا کہہ کر میں نے حوالدار کو اشارہ کر دیا۔

خیبر خان بشارت کے عقب میں چھا کر کھڑا ہو گیا۔ اس صورت حال اور میرے بدلے ہوئے تیوروں نے اسے بتا دیا کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ وہ چونکا نظر سے میرے جانب دیکھتے ہوئے اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا انداز فرار ہونے والا تھا مگر اس کے عقب میں موجود حوالدار نے پلک جھپکنے میں آگے بڑھ کر اس کی گردن میں اپنے بازو کی قینچی ڈال دی۔

میں نے کڑک کر کہا "ہمیں کھڑے کھڑے شرافت سے سچ اگلو گے یا تمہیں ٹرائل روم کی سیر کرائی جائے؟"

"م...... میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے" وہ منمنایا۔ حوالدار کے بازو کی گرفت کسی شکنجے سے کم نہیں تھی۔

میں نے رعب دار آواز میں پوچھا "تم نے جو بھی جھوٹ بولا ہے اسے نبھا نہیں پایا۔ بتاؤ، دس اکتوبر کی صبح سے لے کر گیارہ اکتوبر کی دوپہر تک تم کہاں تھے؟" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اسی درشتی سے اضافہ کیا "گیارہ اکتوبر کی دوپہر سے اب تک کے ایڈونچر کا حساب کتاب بعد میں کریں گے"

"آپ میری بات کا یقین کریں......" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا "م...... میں اقبال نگر......" اس سے آگے وہ کچھ نہ بول سکا۔ خیبر خان نے اپنی فولادی گرفت میں مزید سختی بھر دی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"خیبر خان! یہ شرافت کی زبان نہیں سمجھے گا۔ ٹرائل دینے یہ یہاں تک آ ہی گیا ہے تو ذرا اس کا آڈیشن بھی لے لو۔ اسے پوری طرح پتا چلنا چاہیے، ہمارے ٹرائل روم میں کسی کی سنی کی نہیں۔ یہ ایک ایسا اسٹوڈیو ہے، جہاں آڈیشن کے شوقین افراد کی خالص اور پکے چمڑے کے ٹو بائی چار سائز چھتر سے کیسی دھلائی کی جاتی ہے۔ یہ ہوائی فائرنگ سے ڈاکوؤں کے گروہ کو دہشت زدہ کر کے آیا ہے۔ ذرا بتاؤ اسے، اصلی دہشت کس پرندے کا نام ہے۔ اس ہیرو کا شاندار استقبال ہونا چاہیے۔ کیا سمجھے؟"

upload by salimsalkhan@yahoo.com

"سمجھ گیا سرکار!" حوالدار معنی خیز انداز میں مسکرایا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے وہ بشارت کو اپنے ساتھ لے گیا۔

اس کے جانے کے بعد الیاس کسی چھلاوے کی طرح اچھلنے لگا۔ وہ غصیلے انداز میں بار بار ایک ہی جملے کی تکرار کر رہا تھا "آپ نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ جھوٹ بول کر ہمیں پھنسایا ہے۔"

"زیادہ شور مچانے کی ضرورت نہیں" میں نے اسے ایک دبکا مارا "جھوٹ میں نے نہیں بلکہ تمہارے اس بدبخت بچے نے بولا ہے...... نہ صرف قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی بلکہ تم سے بھی غلط بیانی کی ہے۔ یہ مردود دس اکتوبر کو اقبال نگر ہرگز ہرگز نہیں گیا۔ اس نے تو پچھلے ایک ماہ سے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا۔ آئی سمجھ میں بات؟ میں نے بڑی پکی تصدیق کر لی ہے!"

"لیکن اس نے تو مجھے بتایا تھا......؟" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر پریشان نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"اس نے تم سے جھوٹ بولا ہے، بکواس کی ہے" میں نے تیز آواز میں کہا۔

وہ بیوقوفوں کی طرح میرا منہ تکنے لگا "اگر بشارت اقبال نگر نہیں گیا تو پھر کہاں غائب تھا؟"

"اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہی تو میں نے اسے ٹرائل روم میں بھیجا ہے!" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "تمہیں یہ معلوم ہی ہوگا، وہاں تو پتھر بھی بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں!"

سوڈا واٹر کی طرح ابلنے والا الیاس پلک جھپکنے میں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس کی ساری اکڑفوں غائب ہو گئی۔ میرے الفاظ کی سنگینی نے اسے بہت دور تک سوچ پر مجبور کر دیا تھا۔

بشارت کی زبان کھلوانے کے لیے حوالدار کو اچھی خاصی محنت کرنا پڑی لیکن بہرحال یہ محنت "رنگ" لے آئی اور اگلی صبح طلوع ہونے سے پہلے اس نے اپنے کارنامے کا احوال پوری تفصیل سے بیان کر دیا۔

اس لرزہ خیز واردات کا اصل ذمے دار بشارت ہی تھا تاہم کچھ اور کریکٹرز بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ اس نے رانی کو حاصل کرنے کے لیے ایک انوکھی راہ اپنائی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن سیدھی راہ سے ان کا ملاپ ممکن نظر نہیں آتا تھا لہٰذا انہوں نے ایک تیسرے کردار کی مدد سے بھرپور ڈراما رچایا۔ مذکورہ تیسرا کردار تھا رانی کی چھوٹی خالہ اور بشارت کی پھوپی سلمٰی۔

سلمٰی نے ان کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا پھر تینوں کے درمیان لائحہ عمل تیار ہوا۔ اس منصوبے کو نہایت ہی خفیہ رکھا گیا سلمٰی شاہ کوٹ میں اپنے ایب نارمل بیٹے منظور جھلا کے ساتھ رہتی تھی۔ شادی کے سلسلے میں وہ دس دن پہلے ہی چک بتیس آ گئی اور گھر کی چابیاں بشارت کو دے دیں کہ وہ ایک دو روز رانی کو وہاں ٹھہرائے بعد میں اس کی تلاش میں نکلے اور اسے برآمد کر کے سامنے لے آئے۔ اس کا یہ کارنامہ سب کو متاثر کرے گا خصوصاً اس کے لیے اللہ بخش کا دل ضرور پگھلے گا اور وہ ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ سلمٰی کو چونکہ شادی کے بعد بھی چند روز چک بتیس میں رکنا تھا اس لیے یہ منصوبہ بن جاتا۔

اب مسئلہ رانی کو بھری برات میں سے نکالنا تھا۔ بشارت نے اس سلسلے میں پانچ ڈاکوؤں کی خدمات حاصل کیں۔ چھٹا وہ خود ان میں شامل ہو گیا۔ ڈاکوؤں کو اس نے چار ہزار روپے اور زیورات وغیرہ پر راضی کیا تھا۔ اس زمانے میں چار ہزار روپے کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔ اسی نوے روپے تولہ سونا مل جاتا تھا۔ بشارت کا منصوبہ تکمیل کے آخری مراحل میں تھا کہ اقبال نگر والا اس کا جھوٹ پکڑے جانے سے سب کچھ خاک میں مل گیا۔

میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ دلہا کا قتل ان کے پروگرام کا حصہ نہیں تھا مگر ایک ڈاکو کی جلد بازی سے وہ مارا گیا، عارف کے قتل کا الزام اس نے ایک ڈاکو کے سر ڈال دیا۔ میں نے ڈاکوؤں کی گرفتاری کے سلسلے میں اس پر دباؤ ڈالا تو وہ کوئی رہنمائی نہ کر سکا۔ اس سازش میں بشارت، رانی اور سلمٰی برابر کی شریک تھیں لیکن تینوں کے جرائم کی نوعیت مختلف تھی لہٰذا میں نے ضابطے کی کارروائی مکمل کر کے انہیں حوالہ عدالت کر دیا۔

کچھ عرصے تک ان پر کیس چلتا رہا اور پھر عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ میں آپ کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ عدالت نے اس کیس میں انہیں کیا سزا سنائی۔ آپ اپنے ذہن کو زحمت دیں اور عدالتی فیصلے تک پہنچنے کی کوشش کریں مجھے امید ہے، آپ کامیاب ہو جائیں گے۔

مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ دلوں میں پسندیدگی کے جذبات رکھنے والوں کو ملاپ کے لیے کوئی ایسی منفی راہ نہیں اپنانا چاہیے کہ بھیانک انجام سے دوچار ہونا پڑے کیونکہ ایسی تاریک راہ میں کوئی میٹھی چھری بڑے غیر محسوس انداز میں اپنا کردار کر کے پچھتاوے کے گہرے غار میں پھینک کر چلی جاتی ہے۔

رانی اور بشارت کے کیس میں سلمٰی نے میٹھی چھری کا کردار کیا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)